E mail: adab.rang@gmail.com

فہرست

حمدِ باری تعالیٰ

مظفر وارثی

تصور سے بھی آگے تک درو دیوار کھل جائیں
میری آنکھوں پہ بھی یارب تیرے اسرار کھل جائیں

میں تیری رحمتوں کے ہاتھ خود کو بیچنے لگوں
مری تنہائیوں میں عشق کے بازار کھل جائیں

جوارِ عرشِ اعظم اس قدر مجھ کو عطا کردے
مرے اندر کے غاروں پر ترے انوار کھل جائیں

اندھیروں میں بھی تو اتنا نظر آنے لگے مجھ کو
کہ سناٹے بھی مانندِ لبِ اظہار کھل جائیں

مرے مالک مرے حرفِ دعا کی لاج رکھ لینا
ملے تو بہ کو رستہ ، بابِ استغفار کھل جائیں

مظفر وارثی کی اس قدر تجھ تک رسائی ہو
کہ اس کے ذہن پر سب معنی افکار کھل جائیں

نعت (مسدس)

میر تقی میر

جرم کی کھو شرمگینی یا رسول
اور خاطر کی حزینی یا رسول
کھینچوں ہوں نقصان دینی یا رسول
تیری رحمت ہے یقینی یا رسول
رحمۃ للعالمینی یا رسول
ہم شفیع المذنبینی یا رسول

لطف تیرا عام ہے کر مرحمت
ہے کرم سے تیرے چشم مکرمت
مجرم عاجز ہوں کر ٹک تقویت
تو ہے صاحب تجھ سے ہے یہ مسئلت
رحمۃ للعالمینی یا رسول
ہم شفیع المذنبینی یا رسول

کیا سیہ کاری نے منھ کالا کیا
بات کرنے کا نہیں کچھ منھ رہا
رحم کر خاک مذلت سے اٹھا
میرے عفو جرم کی تخصیص کیا
رحمۃ للعالمینی یا رسول

ناول: گمنام (قسط نمبر 9)

ازقلم: مسکان احزم

"تم کامیڈی بہت اچھی کر لیتی ہو۔ "وہ سینٹرل پارک میں واقع ایک تنگ سی مگر لمبی سڑک پر جاگنگ کر رہی تھی کہ تبھی اسے اپنے عقب سے ایک شناسا آواز سنائی دی۔

بھاگتے قدم یکدم رکے تھے اور ایڑیوں کے بل پلٹے تھے۔

پیچھے وہی دشمنِ جاں اپنی آنکھوں میں کائنات کے سارے خوبصورت رنگ لیے کھڑا تھا۔

وہ جواب دیئے بغیر ایک تھیکی سی نظر اس پر ڈالتی ہوئی دوبارہ بھاگنا شروع ہو گئی۔

اس چھوٹی سی روڈ کے دونوں طرف درخت قطار در قطار کھڑے تھے۔ یہ درخت یقیناً بہار میں سرسبز ہوتے ہوں گے مگر اب تو ان پر خزاں نے ایسا حملہ کیا تھا کہ دور دور تلک صرف زرد رنگ ہی ہر طرف پھیلا نظر آ رہا تھا۔

بے جان ہو کر گرتے پتے ہوا کے جھونکوں کے سنگ لہراتے ہوئے اپنی شاخوں سے کچھ ہی فاصلے پر گر رہے تھے۔

کچھ تو اپنے ہی تنوں کے قدموں میں جا گرے تھے اور کچھ وہاں سے گزرتے انسانوں کے قدموں تلے روندے جا رہے تھے۔

"ویسے تمہیں تو میرا مشکور ہونا چاہیے کہ میں نے تمہیں اتنا وائرل کر دیا ہے کہ اب تو ہر کوئی تمہیں جاننے لگا ہے۔ "وہ بھی اس کے ساتھ اتنی ہی اسپیڈ سے بھاگنے لگا جس رفتار سے وہ بھاگ رہی تھی۔

وہ خاموش سی بھاگتی رہی۔

"اب تو ہر کوئی تمہیں دیکھ کر خوشی سے چلا کر کہتا ہوگا کہ وہ دیکھو نیویارک کی کامیڈی کوئین جا رہی ہے۔ "

وہ اپنی ہر بات کے اختتام پر ہنس رہا تھا اور پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔

وہ رکی اور کچھ پل خونخوار نظروں سے اس کی ہیزل گرین آنکھوں میں جھانکتی رہی۔۔ وہ اس کے یوں دیکھنے پر بھی سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔

مگر اسے بھی لوگوں کو سنجیدہ کرنا آتا تھا۔

ایک زبردست گھونسا اس کے منہ پر رسید کر کے وہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر سنجیدہ سی کھڑی ہو گئی۔

اس گھونسے کے بعد سائمن بھی اتنا ہی سنجیدہ ہو گیا کہ جتنا اس وقت وہ ہو سکتا تھا۔

ظاہری سی بات ہے کہ گھونسا اس کی ایک آنکھ کے قریب پڑا تھا جس سے اس کی ایک ہیڈ لائٹ کام کرنا چھوڑ گئی تھی۔

جواباً وہ بھی حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا مگر الیانا نے ایک کک اس کے گھٹنے کے قریب پوری شدت سے لگا کر اس کے حملے کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔

"بڑی ہنسی آ رہی تھی نا تمہیں۔ لو، اب اور ہنسو۔ "یہ کہتے ہی اس نے ایک اور گھونسا اس کی دوسری آنکھ کے قریب دے مارا اور یہ اس کی

دوسری ہیڈ لائٹ بجھی گئی۔

"بے چارہ۔گرل فرینڈ سے مار کھا رہا ہے۔ "پاس سے گزرتے ایک شخص نے اپنے ساتھ والے شخص کے ساتھ تبصرہ کیا۔

"اوہیلو۔ یہ چمگادڑ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔ "آنکھ اور ٹانگ کو بیک وقت سہلاتے اس نے اس شخص کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

"بس ایک مکا کھا کر ہی اس رشتے سے دستبردار ہو گئے ہو۔ "دوسرا شخص بھی ہنس دیا۔

جبکہ وہ اس ساری گفتگو کے دوران کھا جانے والی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

"لو۔اب تم بھی مشہور ہو جاؤ گے۔ "سینے پر بازو باندھے اس نے حساب برابر کر دیا تھا۔

"مطلب؟ "اس کی اس بات پر وہ اپنی آنکھوں اور ٹانگ سے اٹھنے والے درد کو بھول چکا تھا۔

"اس لڑکے کو دیکھ رہے ہو۔ "اس نے موڑ کے آغاز پر کھڑے ایک بیس اکیس سالہ لڑکے کی طرف اشارہ کیا جو موبائل ہاتھ میں پکڑے ان کی وڈیو بنا رہا تھا۔

"جہاں سے گزرو گے وہاں سب یہ ہی کہیں گے کہ وہ دیکھو وہ بہادر لڑکا جا رہا ہے جو اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھوں بری طرح سے پٹ رہا تھا۔اور پاس سے گزرتے وہ دونوں آدمی اس واقعے کے سچے ہونے کی گواہی دیتے پھریں گے۔ "

وہ اس لڑکے کی طرف بڑھنا چاہتا تھا مگر ٹانگ حرکت کرنے سے انکاری تھی۔

"بہت برا ہوا سائمن۔بہت برا ہوا۔ "اس کی آنکھوں میں جھانکتی وہ اپنی ساری بے عزتی کا حساب لے گئی تھی بلکہ تھوڑی سی اوپر بھی کر گئی تھی۔

"میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں الیانا۔ "مارے ضبط کے اس کی رگیں پھولتی دکھائی دے رہی تھیں۔

"تم الیانا کو کبھی چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ "ذومعنی لہجے میں بہت کچھ کہتی وہ وہاں سے چل دی۔

جبکہ وہ سارے درد اور ساری بے عزتی کو بھول کر اس کے آخری جملے میں کھو گیا۔

پتوں کا وہی کھیل جاری تھا۔

مگر اس ایک لمحے میں محبت کی بہار نے نفرت کی خزاں کو مات دے دی تھی۔

سبزہ ہی سبزہ ہر طرف پھیل گیا جس نے زرد رنگ کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔

پھول ہی پھول کھل چکے تھے۔

الیانا سے سائمن تک۔

سائمن سے الیانا تک۔

اور" گمنام "داستاں ایک دفعہ پھر محبت کی روایت لکھنے کے لیے لفظ ترتیب دینے لگی تھی۔

(------------------)

"ایس پی میرے بیٹوں کو رہا کر دو ورنہ بہت برا ہو گا۔ "اگلے ہی دن ملک صاحب کے دونوں بیٹے حوالات کے اندر تھے اور اطلاع ملتے

ہی ملک صاب بھی جیل میں آن موجود ہوئے تھے۔

"اگر وہ رہا ہو گئے تو اس سے بھی زیادہ برا ہو گا۔ " کیس کی فائلز کو جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ پل بھر کے لیے رکا تھا۔

"ایس پی صاب میرا خیال ہے کہ تم ابھی مجھے اچھی طرح سے جانتے نہیں؟ "اس نے بغور اشہد ابراہیم کا چہرہ دیکھا جہاں کسی قسم کے تاثرات موجود نہیں تھے۔

"مجھ سے زیادہ آپ کو کون جان سکتا ہے ملک صاب؟ "فائل ایک طرف کرکے وہ براہِ راست ملک صاب کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

اور پہلی دفعہ اس تھانے میں موجود کوئی انسان ملک صاب سے اس انداز میں بات کر رہا تھا۔

"دیکھیں ملک صاب۔ آپ کے بیٹوں کو پولیس نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔گاں کی عزتیں اتنی بے مول نہیں ہیں کہ میں بنا کسی کاروائی کے یا بنا کسی سزا کے انہیں جانے دوں کہ جاؤ اور جس کا چاہو شکار کر لو۔ایس پی اشہد ابراہیم کچھ بھی برداشت کر سکتا ہے مگر کسی کی جان اور عزت پر کمپرومائز نہیں کر سکتا۔ "لہجے کی کاٹ کو محسوس کیا جا سکتا تھا اور سیاہ آنکھوں سے جھلکتی نفرت کو بظاہر دیکھا جا سکتا تھا۔

"اشہد ابراہیم !دو دن کا وقت دے رہا ہوں تمہیں۔میرے بیٹے گھر آ جانے چاہیئں ورنہ وہ انجام کروں گا تمہارا کہ ساری دنیا اسے عبرت کے طور پر لے گی۔ "ملک صاب اپنے کلف سے اکڑے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

"ملک صاب میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں مگر آپ نے مجھے دوبارہ تھانے میں آ کر دھمکی دی تو اسی وقت آپ کے خلاف پرچہ کاٹ دوں گا۔"ملک صاب کے احترام میں وہ بھی کھڑا ہو گیا مگر جس انداز میں کھڑا ہوا تھا سامنے والا اس پر واری بھی جا سکتا تھا۔

"جوان خون ہے نا۔اس لیے جوش مار رہا ہے۔جوش مارتے خون کو پرسکون کرنا ملک صابکو اچھی طرح سے آتا ہے ایس پی۔ "وہ بھی ملک صاب تھے۔نہایت ڈھیٹ انسان۔

" کرم دین ! گاڑی نکالیں مجھے باہر ضروری کام سے جانا ہے۔اللہ حافظ ملک صاب۔ "وہ مزید ان سے کوئی بحث نہیں کر سکتا تھا اس لیے کوئی بھی جواب دیئے بنا ایک اچٹتی سی نظر ان پر ڈالتے وہ ان سے پہلے ہی باہر نکل گیا۔

جبکہ ملک صاب اپنا غصہ پینے کے سوا اس وقت کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

بگڑے شتر کی لگام جب کھینچی جائے تو وہ ایسے ہی بے بس ہوتا ہے۔

)-------------------(

دھند پورے شہر پر اپنا راج قائم کر چکی تھی۔تا حدِ نگاہ ہر چیز دھندلا سی گئی تھی۔

دھند کی بھینی بھینی سی خوشبو فضا کو معطر کر رہی تھی۔ ہر چیز پر نمی سی چھائی ہوئی تھی۔ گیلی سڑک پر تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ بالآخر اس گھر کے سامنے موجود تھی جہاں وہ اس رات کھڑی تھی کہ جس رات میں اسے ٹھکرا دیا گیا تھا۔

سامنے نظر آنے والی کھڑکی کو اس شخص نے اس پر نفرت سے بند کر دیا تھا مگر وہ پھر اس کھڑکی کے نیچے آ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ کچھ دیر اس کھڑکی کے نیچے کھڑی رہی۔

شام دھیرے دھیرے سے نیویارک سٹی پر اپنے پر پھیلا رہی تھی۔گھروں کے باہر لگی لائٹس روشن ہو رہی تھیں۔

کچھ سوچتے ہوئے اس نے قدم گھر کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھا دیئے اور پہلی بار اس گھر کے دروازے پر ایک امید سے دستک دے دی۔

جب کافی دیر کسی نے دروازہ نہیں کھولا تو اس نے دروازے کو اندر کی جانب دھکیلا تو وہ کھلتا ہی چلا گیا۔پلٹ کر دروازہ بند کر کے وہ گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

سامنے ایک سٹنگ روم تھا۔وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

کمرہ بہت گرم تھا وہاں آتش دان میں جلتی آگ نے کمرے کو بہت حد تک گرم کر دیا تھا۔

بوڑھا فرانسیسی آتش دان کے آگے آرام دہ کرسی پر بیٹھے ایک کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا۔

اس کے یوں اندر داخل ہونے پر اس نے اپنی موٹی سی عینکوں کے پیچھے سے اسے بغور دیکھا تھا۔

"معذرت چاہتی ہوں بنا اجازت کے ہی اندر داخل ہو گئی ہوں۔دراصل میں کافی دیر باہر گھنٹی بجاتی رہی مگر کسی نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔ "وہ جیسے جیسے بات کو آگے بڑھا رہی تھی ویسے ہی اس کے قدم بھی اندر بڑھتے جا رہے تھے اور بات کے اختتام پر وہ بوڑھے فرانسیسی کے سر پر آن موجود تھی۔

" گھنٹی خراب ہے۔ "وہ اس پر ایک جانچتی نظر ڈالتے ہوئے دوبارہ کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

جوان لڑکیوں میں ویسے ہی اس کی اب دلچسپی ختم ہو گئی تھی اس لیے اس نے مزید اس سے کوئی بات نہیں کی۔

"مجھے سائمن سے ملنا ہے۔ " کافی دیر بوڑھے فرانسیسی کی طرف سے خاموشی پا کر اس نے جھجکتے ہوئے بات کے سلسلے کو بڑھایا۔

" کیوں؟"" مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔"اس کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے وہ تحمل سے جواب دے رہی تھی ورنہ ایسے سوالات پر اس کا دماغ گھوم جاتا تھا۔

"تم کیا لگتی ہو سائمن کی؟ "بوڑھے کو شک ہوا تھا۔

"میں اس کی گرل فرینڈ ہوں۔ "وہ طنزیہ بولی۔اسی دوران سائمن اپنی بہن علیشے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تھا۔وہ علیشے کو ویکنڈ پر باہر گھمانے لیکر گیا تھا۔

اسے یوں دیکھ کر وہ حیران ہوا تھا اور اس کی بات سن کر پریشان۔

اس کا جواب سن کر بوڑھے فرانسیسی کی گرفت کتاب پر ڈھیلی پڑی تھی۔

"علیشے تم اپنے کمرے میں جا۔ "وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسی باتوں کا کوئی اثر علیشے کے ذہن پر پڑے۔

علیشے کے جانے کے بعد وہ الیانا کو بازو سے کھینچتے ہوئے باہر گیلی سڑک پر لے آیا۔

اندھیرا کافی حد تک بڑھ چکا تھا لیکن اسٹریٹ لائٹس نے اس اندھیرے کو مات دے دی تھی۔

"یہ تم ہر جگہ یہ ہی کیوں بتاتی پھرتی ہو کہ تم میری گرل فرینڈ ہو۔ "باہر آ کر وہ اس پر دھاڑا تھا۔

"مجھے اس بوڑھے پر غصہ آ گیا تھا۔ "وہ معصومیت سے گویا ہوئی۔

"تم غصے میں کچھ بھی بول دیتی ہو؟ مطلب کچھ بھی؟"وہ اس کے غصہ کرنے کے انداز پر حیران ہوا تھا۔

"میں غصے میں بولتی کم ہوں اور پٹائی زیادہ کرتی ہوں۔مگر اب دیکھونا میں اس بوڑھے کو تو نہیں پیٹ سکتی تھی نا۔ "اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"نہیں پیٹ سکتی تھی تو کوئی اور جواب دے دیتیں تم۔ "وہ سر پیٹ کر رہ گیا۔

" کیوں؟اس جواب میں کیا خرابی تھی؟ "وہ اس کے اس ردِعمل کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

"پہلی خرابی تو یہ ہے کہ ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی مستقبل میں قائم ہونے والا ہے۔دوسری خرابی یہ ہے کہ بوڑھا فرانسیسی اب مجھے اپنے گھر سے نکال دے گا۔بڑی مشکل سے منہٹن میں کوئی جگہ ملی تھی رہنے کے لیے۔ "اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کوئی بھاری پتھر اٹھائے اور اس کے سر پر دے مارے۔

" کیوں نکال دے گا وہ تمہیں گھر سے؟ "وہ حیران ہوئی تھی۔

" کیونکہ اسے ایسی باتوں سے سخت نفرت ہے اور۔۔۔۔۔۔"

"اور تمہیں؟ "اس نے اس کی بات کاٹ دی اور براہِ راست سبز پانیوں میں جھانکنے لگی جو اس کا سب کچھ بہا کر لے گئے تھے۔

"اور مجھے بھی۔آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟اور کیوں میرے پیچھے یوں پڑی ہوئی ہو؟پہلے تم نے مجھے بروک لن میں بے گھر کر دیا تھا اور اب منہٹن کی زمین بھی مجھ پر تنگ کرنے کے ارادے ہیں؟ "وہ دبی دبی آواز میں اس پر چلا رہا تھا۔

"زمین تو تم نے مجھ پر تنگ کر دی ہے۔اس لیے تمہارے گھر کے قریب رہنے کے علاوہ مجھ سے کہیں اور رہا ہی نہیں جاتا۔میں براڈوے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔مگر پھر لوٹ آئی۔کیونکہ میں نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر۔ "اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

آہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جولیٹ چہرے کو ہاتھوں میں چھپا کر رومیو کے آگے بری طرح سے رو دی تھی۔

رومیو اس کے یوں رونے پر پریشان ہوا تھا۔

"الیانا۔ "اس نے اسے لودیتے لہجے میں پکارا۔

مگر جولیٹ نے رونے کا کام جاری رکھا۔

"الیانا۔ "اب کی بار رومیو نے جولیٹ کو کندھوں سے نرمی سے پکڑا تھا۔

جولیٹ نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے تھے اور اپنے رومیو کو سوالیہ انداز میں تکنے لگی۔

"الیانا !میں نہیں سمجھ پا رہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو اور مجھ سے کیا توقع رکھتی ہو۔مگر میں تمہیں کوئی امید نہیں دلانا چاہتا۔میں ایک ناکام انسان ہوں اور مجھ سے مایوسی کے علاوہ تمہیں اور کچھ بھی نہیں ملے گا۔"آخر وہ دل کی بات لبوں پر لے ہی آیا۔

"میرا ایک خواب تھا۔نیویارک کا سب سے بڑا جادوگر بننا مگر حالات و واقعات نے اس خواب کو توڑ دیا۔میری آنکھوں میں اس ٹوٹے

خواب کی کرچیاں آج بھی چبھتی ہیں اوران سے اٹھنے والی تکلیف مجھے اپنے دل میں محسوس ہوتی ہے۔ " کرچیاں ایک دفعہ پھر آنکھوں میں چبھی تھیں اوراس نے درد کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں۔

"سائمن۔ "اسے یوں آنکھیں بند کرتے دیکھ کر وہ پکاری تھی۔

"بعض دفعہ ہم اپنے مقاصد میں اکیلے کامیاب نہیں ہو پاتے۔ہمیں ٹیم ورک کی ضرورت ہوتی ہے۔کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ الیانا سائمن کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر اسے کامیاب کرنے میں تھوڑا سا حصہ ڈال سکے۔ "سائمن کے ہاتھ ابھی بھی الیانا کے شانوں پر تھے اور وہ اس کی باتوں پر سوائے حیران ہونے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"ہم دونوں مل کر امید کی شمعیں جلائیں گے اور دیکھنا ایک دن ایسا آئے گا جب تم نیویارک تو کیا پوری دنیا میں سب سے بہترین جادوگر بن کر ابھرو گے۔ "وہ مسکرا دی تھی۔وہ ابھی سے اسے کامیاب ہوتے دیکھ سکتی تھی۔

" کل بروڈ فیلڈ تھیٹر میں آ جانا۔کامیابی اب تم سے زیادہ دور نہیں ہے سائمن۔ "وہ مسکرائی تھی۔

وہ کوئی جواب نہیں دے پایا تھا۔

" کل ملتے ہیں جادوگر۔ "شرارت سے کہتی وہ وہاں سے چلی گئی۔

شام کے بعد رات منہٹن میں اتر آئی تھی مگر اس رات کے بعد ایک روشن صبح نیویارک کے سائمن کی منتظر تھی اور اس صبح پر الیانا سورج کی مانند چمک کر اس کے لیے روشنی کرنے والی تھی۔

ایک جادو ہمیں آتا ہوتا ہے اور ایک جادو زندگی کو۔

مگر ہم زندگی کے جادو سے زیادہ اپنے جادو پر اعتبار کرتے ہیں اور یہیں پر ہم سب غلطی کرتے ہیں۔

اور" گمنام "داستاں اسی غلطی کو سدھارنے جا رہی تھی۔

)---------------------(

"میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ساری غلطی اس چڑیل کی ہے۔ "اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اسے اسی وقت جیل میں بند کر دیتا بلکہ کسی تاریک کوٹھری میں پھانسی پہ لٹکا دیتا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ایس پی صاب۔میں آپ کے لیے اتنی محنت سے کھیر بنا کر لا رہی تھی کہ اس اندھے بکرے نے گاڑی مجھ میں دے ماری اور ساری کھیر کچی سڑک پر گر پڑی۔ "وہ خونخوار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

ایک طرف اسجل ابراہیم کھڑا تھا جبکہ دوسری طرف رانیہ اور ان دونوں کے درمیان بے چارہ ایس پی اشہد ابراہیم۔

اس کے دونوں طرف کے کان سن ہو رہے تھے۔دونوں کی زبانیں ایک سو بیس کی اسپیڈ سے چل رہی تھیں۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ان دونوں میں سے کس کے حق میں فیصلہ سنائے۔دونوں ہی اپنے اپنے موقف میں کچھ حد تک درست تھے۔

اور وہ کسی حد تک شاکڈ بھی تھا کہ ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا بھی تو کسی حالت میں۔نہ وہ اسے معاف کر سکتا تھا اور نہ ہی وہ اسے یوں

جانے دے سکتی تھی۔

"ایس پی صاحب اس چمگادڑ نے میری گاڑی کے دونوں شیشے بلاوجہ توڑ کر مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تو اگر میں گاڑی سے نکل کر بھاگتا نا تو یہاں اس وقت میری لاش پڑی ہوتی۔ آپ ابھی اور اسی وقت اس کے خلاف پرچہ کاٹیں۔ "اشہد ابراہیم کو لڑکی کے آگے بے بس محسوس ہوتے دیکھ اسجل نے مبالغہ ارائی سے کام لینے کی کوشش کی۔

"نہیں۔ جھوٹ بول رہا ہے یہ۔ پہلے اس نے گاڑی مار کر مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر یہ سب مجھے اپنے دفاع میں کرنا پڑا۔ اس لیے پرچہ اس بندر کے خلاف کاٹیں۔ "ایک ٹھوس دلیل نے اسجل کے پلڑے کو ہلکا کر دیا۔

"بندر کسے بولا تم نے؟ "اندھا بکرا تو وہ اپنے لیے برداشت کر سکتا تھا لیکن "بندر "تو کبھی بھی نہیں۔ بھلا وہ پیارا سا لڑکا شکل سے بندر جیسا لگتا تھا۔

"اسے جس نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھے چڑیل اور چمگادڑ کہا۔ " کمر پر ہاتھ رکھے وہ اس گاں کی سب سے لڑاکا لڑکی محسوس ہو رہی تھی۔ اشہد اسے یوں لڑتے دیکھ کر اپنی آنکھوں اور سماعتوں پر یقین ہی نہیں کر پا رہا تھا۔

"ایک منٹ۔ کیا آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے کوئی مہذب لفظ نہیں استعمال کر سکتے؟ " کب سے وہ ان کی غیر اخلاقی گفتگو سن رہا تھا۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے بھئی۔

"میں مہذب لفظ صرف مہذب لوگوں کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ " کان سے مکھی اڑاتے ہوئے اسجل نے رانیہ پر زبان سے وار کیا تھا۔

"میں بھی۔ "زبان چلانے میں وہ بھی اس سے کم نہیں تھی۔

" کیا آپ دونوں کو پتا ہے کہ آپ لوگ اس وقت کہاں کھڑے ہیں؟ "اس نے ان دونوں کو بے بسی سے احساس دلانا چاہا۔

"لاہور کے چڑیا گھر میں۔ "اس نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ بھئی حد ہی ہو گئی تھی یہاں ایک تو وہ اتنی دور سے اسے شہر سے ملنے گاں آیا تھا۔ بجائے اس کا بھرپور استقبال کرنے کی اس نیا سجل کو ایک مجرم کے طور پر اپنے سامنے کھڑا کیا ہوا تھا۔

"یہ واقعی بندر ہے۔ "وہ منہ میں بڑبڑائی تھی مگر اشہد اس کی بات سن چکا تھا۔ وہ اپنی ہنسی کو چھپانے کے لیے چہرہ فائل کے اوپر جھکا گیا۔

" کیا کہا تم نے جنگلی بلی؟ "اسجل کی چھٹی حس محسوس کر چکی تھی کہ بات اس کے خلاف ہی کی گئی ہے اور وہ بھی کوئی بے عزتی والی۔

"آں۔۔۔ کچھ نہیں۔ "وہ بھی اس کی حالت سے محظوظ ہوئی تھی۔

" کرم دین!۔ "اس سے پہلے کہ وہ جھگڑا ایک دفعہ پھر قتل کر دینے پر پہنچ جاتا اشہد ابراہیم کافی حد تک سنجیدہ ہو چکا تھا۔

کرم دین اندر داخل ہوا تو اشہد نے ہاتھ میں پکڑی فائل اس کی طرف بڑھا۔

"آپ ان دونوں کے بیانات ریکارڈ کریں اور ان دونوں کے خلاف مقدمہ درج کریں۔ آج کی رات یہ دونوں جیل میں رہیں گے۔ "

ماتھے پر ساری دنیا کے بل سجائے اس نے بے رحمی سے ان دو "معصوموں "کے خلاف فیصلہ سنایا تھا۔

"میں نے اس چمگادڑ کو معاف کیا۔ "اشہد باہر جانے کے لیے بڑھنے لگا کہ تبھی اسے اسجل کی آواز سنائی دی۔

اس نے آنکھوں سے وارن کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی بات بدل گیا۔

"مطلب میں اس لڑکی کو معاف کرتا ہوں۔ "جیل میں رہنے سے بہتر تھا کہ وہ اس "چڑیل "کے لیے کوئی مہذب لفظ استعمال کر لے۔کتنا سمجھدار تھا نا اسجل ابراہیم۔

وہ اب رانیہ کی طرف متوجہ ہوا کہ آخر وہ کس فیصلے پر پہنچی ہے۔

"میں بھی اس بندر کو۔۔۔میرا مطلب ہے کہ میں بھی اس لڑکے کو معاف کرتی ہوں۔ "اسجل والا خیال رانیہ کے بھی خالی دماغ میں آیا تھا۔"

" کرم دین ! صلح نامہ تیار کرو۔ "شرارت سے کہتا وہ وہاں سے نکل گیا۔

اسجل بھی اس کے پیچھے ہی ہو لیا جبکہ رانیہ اپنے گھر کے راستے پر چل دی۔

"رانیہ۔ "اشہد کی آواز پر وہ واپس پلٹی۔

"جی صاب جی۔ "وہ اس کے یوں پکارنے پہ حیران ہوئی تھی کہ کہیں وہ واقعی اسے آج کی رات جیل میں بھیجنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔

"یہ میرا چھوٹا بھائی ہے اسجل ابراہیم۔شہر سے یہاں مجھے ملنے آیا ہے۔ "اگر یہ ہی تعارف وہ پہلے کروا دیتا تو تھانے میں اتنا ہنگامہ نہ ہوتا۔

"معاف کیجیے گا صاب جی۔مجھے معلوم نہیں تھا۔ "اف کیا سوچ رہے ہوں گے ایس پی صاحب کہ میں نے ان کے بھائی کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ "یہ بات وہ صرف سوچ کر ہی رہ گئی۔

"اور اسجل ! یہ ہیں رانیہ۔ "اس نے رانیہ کی طرف ایسے اشارہ کیا جیسے برسوں سے آشنائی ہو۔

"رانیہ؟ "اس نے سوالیہ انداز میں ابرو اچکاتے ہوئے اپنے بھائی کی طرف دیکھا جو ابھی بھی اس لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"رانیہ۔۔۔۔۔۔ "وہ سوچنے لگا کہ اب رانیہ کا تعارف کن الفاظ میں کروائے۔

"جی رانیہ؟ "وہ تفتیشی انداز میں بازو سینے پر باندھے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"میں چلتی ہوں صاب جی۔ "اسجل کے بگڑتے تیور دیکھ کر اس نے موقعے سے فرار ہو جانا چاہا۔

"چلو میں تمہیں اپنا گھر دکھاتا ہوں۔ "رانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے اس نے بھی فرار حاصل کرنے کی کوشش کی۔

"بات سے فرار حاصل نہ کریں بھائی۔ "وہ اشہد کے ارادوں کو بھانپ چکا تھا۔

" گھر تو چلو۔بتا دیتا ہوں سب کچھ۔ "وہ بھی جانتا تھا کہ اسجل بنا اصل بات کے جانے سکون سے نہیں بیٹھے گا۔

جاری ہے۔

ناول: جو میری آنکھوں سے خواب دیکھو (قسط 4)

تحریر: یاسمین ملک

سلطان زمان مقبوضہ کشمیر کے ایک خوبصورت گاؤں کی معزز شخصیت میں شمار ہوتے تھے۔ان کے تین بیٹے تھے۔بڑے بیٹے حسن زمان، منجھلے بیٹے ظہیر زمان اور سب سے چھوٹے بیٹے کا نام شکیل زمان تھا۔سلطان زمان کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔گاؤں میں ان کی کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی زمینیں تھیں۔مگر حالات نے پلٹا دکھایا، دولت کو زوال آیا، زمینیں محدود ہو گئیں۔اس صورتحال میں انہوں نے گاؤں سے سری نگر شہر منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔سری نگر کے خوبصورت علاقے میں اپنی جمع پونجی سے دو منزلہ گھر بنوا کر وہاں شفٹ ہو گئے۔ان کے بڑے بیٹے حسن زمان کی شادی دور پرے کی رشتہ دار گل بانو سے ہوئی تھی جنھیں سب پیار سے بی جان کہہ بلاتے ہیں۔گل بانو اور حسن زمان کے تین بیٹے ہیں۔جہانزیب، عالمگیر اور جہانگیر۔عالمگیر اور جہانگیر دونوں جڑواں ہیں۔ظہیر زمان کی شادی تاجور سے ہوئی، ان کی اکلوتی اولاد زرمینے ظہیر ہے۔ظہیر زمان شادی کے کچھ عرصے بعد بیرون ملک ملازمت کے لئے روانہ ہو گئے تھے، جہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد وہ وطن واپس آ رہے تھے، مگر پلین کریش ہونے کی وجہ سے دنیا سے رخصت ہو گئے، اسوقت زرمینے صرف ایک سال کی تھی۔تاجور کے بیوہ ہونے کے باوجود حسن زمان نے انہیں میکے واپس جانے سے روک دیا تھا، وہ زرمینے کو اپنی بیٹی مانتے ہیں، وہ ان سے بہت قریب تھی۔تیسرے بیٹے شکیل زمان اور صغری بی بی کے تین بچے ہیں۔زین، تانیہ اور نبیل۔شکیل زمان نبیل کی پیدائش کے بعد سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، علاج چلتا رہا، مگر وہ جانبر نہ ہو سکے اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ان کے انتقال کے بعد حسن صاحب کی ذمہ داریوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا مگر انہوں نے اپنے بھتیجے، بھتیجیوں کے سر پر دست شفقت رکھ کر اپنے تایا ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔اب حسن صاحب کو گھر کے سرپرست کی سی حیثیت حاصل ہے، یوں یہ خاندان ایک ہی چھت تلے پیار و محبت سے مثالی زندگی گزار رہا ہے۔

x-------------------------x

موسم گرما کی ٹھنڈی دوپہر تھی۔بادلوں نے سورج کو ڈھانپ رکھا تھا۔دھوپ چھاؤں کے آنکھ مچولی جاری تھی، کبھی تیز ہوا کے سنگ پتے جھومنے لگتے تو کبھی دھوپ درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آتی، زمین پر پڑنے کے لئے بیتاب ہو جاتی۔بی جان صحن میں موجود پیڑ کے نیچے کرسی لگا کر بیٹھیں بڑی سی سفید چادر پر فاصلے فاصلے سے شیشے ٹانک رہیں تھیں۔ان کے بائیں جانب تاجی سبزی کا ٹوکرا لیے سبزیاں کاٹنے میں مشغول تھیں۔دائیں جانب تھوڑے زیادہ فاصلے پر صغری چچی تانیہ کو زبردستی اپنے پاس بیٹھا کر اسکے روکھے بالوں میں تیل لگا رہی تھیں۔ساتھ ہی کئی صلواتیں بھی سنا چکی تھیں، جسے وہ برا سا منہ بنا کر چپ چاپ سننے پر مجبور تھی۔

"تائی، جانزی کو دیکھا ہے، گھر پر ہیں؟ زرمینے ہاتھ میں رجسٹر پکڑے صحن میں آئی تھی۔

" کتنی دفعہ کہا ہے، بڑا ہے وہ تم سے، تمیز سے نام لیا کرو۔" تاجی اپنی اکلوتی بیٹی پر گرجیں۔

"ارے، تاجور، صغری تم لوگوں نے سمجھا ہوا کیا ہے میری پریوں کو، کب سے ڈانٹیں جا رہی ہو؟، بی جان نے اپنا کام روک کر کہا۔

"دیکھا، دیکھا بی جان، مجھے تو لگتا ہے کہ ان دونوں خواتین نے مجھے اور تانی کو آپ سے گود لیا تھا" شرارت سے کہتی وہ بی جان کے پیچھے چھپ گئی، تاجی سے کوئی بعید نہیں تھی وہ "ایشین ماؤں کے عالمی ہتھیار" جوتے کا استعمال کر کے زری کو سگی ماں ہونے کا ثبوت دے کر عقل ٹھکانے لگا تیں۔ تاجی اور صغری چچی ہنس پڑی تھیں۔ "زیبی بھائی، اپنے کمرے میں ہیں" تانی نے اسے اطلاع دی۔ زری نے گھر کے اندرونی حصے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ "جانزی، مجھے یہ سوال سمجھ نہیں آ رہا سمجھا دیں پلیز''۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اپنی دھن میں کہتی اندر آئی تھی۔ وہاں پہلے سے موجود زین کو دیکھ کر اسکے چہرے کے زاویے بگڑے۔ "مینرز نہیں ہیں، دروازے پر ناک کر کے اندر آتے ہیں جنگلی بلی"۔ جنگلی بلی کے لقب پر وہ تپی، مگر چپ رہی، پرسوں ہونے والی تازہ جھڑپ کی وجہ سے ان کی بات چیت بند تھی۔ اسلئے وہ زین کی باتوں پر برے برے منہ بنانے پر ہی اکتفا کر رہی تھی۔ ان دونوں کی آپس میں ٹھنی رہتی تھی۔ گھر میں یہ دونوں مشہور کارٹون سیریز کریکٹرز ٹام اینڈ جیری مشہور تھے۔ "اوہ، نخرے تو دیکھو محترمہ کے، زری کی خاموشی پر زین کو ذرا مزہ نہ آیا۔ "خیر جو بھی ہو۔۔ میں نے اشفاق سر سے بات کرنے کا سوچ لیا ہے، وہ جب بھی تمیز کی کلاسز ارینج کریں، تمہارا نام لسٹ میں اول رکھیں، آخر کو خیر خواہ ہوں میں تمہارا" وہ دل جلانے والی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولا۔

زرمینے نے خونخوار نظروں سے سے دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی، جہانزیب بول اٹھا۔ "ایک منٹ، ایک منٹ اگر تم دونوں کا لڑنے کا ارادہ ہے تو بتا دو، میں تب تک اپنا کام نمٹالوں"

"جانزی اس سے کہیں کہ یہ جس دروازے سے اندر آیا ہے وہ کمرے سے باہر جانے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے''، جہانزیب کے ٹوکنے پر زرمینے نے اسکی آڑ میں زین کو سنا کر یہ بھی جتا دیا تھا کہ وہ فی الحال اس سے براہ راست بات نہیں کریگی۔ "اوہ، محترمہ ناراض ہیں، اچھی بات ہے رہو ناراض، تھوڑ مجھے بھی آرام رہے گا، اس نے پھر سے اسے چھیڑا۔ "زین، تمہارا کام تو ہو گیا ہے نہ"، جہانزیب نے اس یاد دلایا۔ "جا رہا ہوں بھائی، ویسے تمہارا شکریہ "ہنس کر کہتے ہوئے آنے اپنی چیزیں سمیٹ کر زرمینے کو شرارت سے دیکھا۔ "جنگلی بلی" جھک کر تقریباً چیختے ہوئے اس کے کان میں کہہ کر وہ جاتے جاتے بھی اسے تنگ کرنا نہ بھولا تھا۔ زرمینے کو کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے، "ایڈیٹ، وہ چلائی۔ پھر جہانزیب کی طرف مڑی۔ "اسی طرح یہ میرا ٹائم ویسٹ کرتا ہے "رجسٹر اسکی طرف بڑھا کر منہ بسورا۔ ارے ہاں یاد آیا۔۔ سر اشفاق نے کہا تھا، جہانزیب سے کہنا مجھ سے آ کر ملے "یاد آنے پر اس نے اطلاع دی۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر اسے سوال سمجھانے لگا۔

x------------------------x

وہ دومنزلہ چھوٹی سی عمارت میں داخل ہوا تھا۔ عمارت کا گراؤنڈ فلور اور پہلی منزل اشفاق صاحب نے لڑکیوں کی تعلیم وقف کر رکھا تھا۔ جہاں صبح اسکول اور شام میں کالج کی لڑکیوں کو ٹیوشن فراہم کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مددگار اساتذہ بھی رکھے ہوئے

تھے جو کشمیری عوام خصوصاً لڑکیوں کو جاہل ہونے سے بچانے کے لئے تعلیم سے بہرہ مند کر رہے تھے۔ان کی یہ کوششیں کئی سال سے جاری تھیں جس میں وہ اللہ کی مدد سے کامیاب رہے تھے۔"اسلام علیکم سر"، وہ جہانزیب کو گراؤنڈ فلور پر ملے۔"وعلیکم اسلام، میرے ہونہار شاگرد"، وہ دوسرے ہی دن جہانزیب کو وہاں دیکھ کر خوش ہوئے تھے، اسے لے کر وہ اپنے آفس آئے تھے، آفس کیا تھا، ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں میز، کرسیوں کے علاوہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔"کیا لوگے؟ چائے یا جوس؟"۔"نہیں، سر تکلف مت کیجئے"اس نے مسکرا کر سہولت سے انکار کیا۔"تکلف کیسا؟ چائے ٹھیک رہے گی"، انھوں نے چائے کے دو کپ منگوا لیے تھے۔"جی تو میرے برائٹ اسٹوڈنٹ کہاں تک پہنچی آپ کی جدوجہد"؟ انھوں نے اس کی جاب سے متعلق دریافت کیا۔"سر، چل رہی ہے جدوجہد"، وہ سنجیدہ ہوا۔"ہوں، کوشش جاری رکھنی چاہیے، ہار نہیں ماننی چاہیئے"، انھوں نے اس کی ہمت بندھائی۔اس نے اثبات میں سر ہلا کر ان کی تائید کی۔"میں چاہتا ہوں، تم اپنی پڑھائی مکمل کرلو"، ان کی بات پر وہ چونکا۔"پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کے دس طلباء کو اسکالرشپ پروگرام کے تحت مفت تعلیم دینے کا اعلان کیا ہے، میں چاہتا ہوں، تم بھی اپلائی کر کے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرلو"انھوں نے اسے بلانے کا مقصد بتایا۔"دیکھو بیٹا، میں جانتا ہوں تم پاکستان جانے کے لئے آمادہ نہیں ہو، انھوں نے اسکی خاموشی سے نتیجہ اخذ کیا،"بیٹا مٹی کی محبت انسان کے خمیر میں شامل ہے، یہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ ہے، انسان جہاں کہیں بھی رہ لے بالا آخر مٹی کی محبت اسے دھرتی ماں کی طرف کھینچ ہی لاتی ہے، اب اس محبت کے بھی کچھ تقاضے ہیں نہ"اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔"میری ان سب باتوں کا مقصد یہی ہے کہ تعلیم ہی خیر اور تبدیلی لا سکتی ہے، اس لئے تم اس موقعے کو ہاتھ سے جانے نہ دو، اپنی تعلیم مکمل کر کے یہاں کی عوام کے لئے کام کرو، وہ چند لمحے رکے،"نوجوانان کشمیر ہی اس خطے کی تقدیر بدل سکتے ہیں، اپنے حصے کا چراغ جلا کر غلامی کے کالے اجالوں کو مٹانا ہے، آزادی کی امید کے دیے، جن کی لو مدہم ہوگئی ہے، ان میں جدوجہد کا تیل ڈال کر روشنی تیز کرنی ہے"جہانزیب خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا۔"تمہاری کیا رائے ہے؟؟"بات مکمل کر کے انھوں نے اس کی رائے معلوم کرنی چاہی۔"سر، میں آپ کو سوچ کر جواب دوں گا"، چائے کے کپ کی سطح پر جمی بالائی کو پرسوچ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے سوچنے کے لئے وقت مانگا۔

"مائے ڈیئر اسٹوڈنٹ، وقت ہی تو نہیں ہے ہمارے پاس، مجھے امید ہے کہ تم آج رات تک فیصلہ کر کے مجھے انفارم کردوگے"، نرمی سے کہتے ہوئے انھوں نے سے جلدی فیصلہ کرنے کی تاکید کی تھی۔

x-------------------------x

رات کے کھانے پر سوائے حسن مراد کے پورا گھرانہ موجود تھا۔وہ مغرب کے بعد ہی کھانا کھانے کے عادی تھے اسلیئے وہاں موجود نہیں تھے۔دائیں جانب بی جان، تاجی، صغری چچی، زرمینے اور تانیہ موجود تھیں جب کہ بائیں جانب جہانزیب، زین، ٹوائن برادرز (عالمگیر اور جہانگیر) اور نبیل اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان کھانا کھانے میں مصروف تھے۔زرمینے پلیٹ میں چمچ ہلاتی گہری سوچ میں گم تھی، وہ وقفے وقفے سے سب پر نظر ڈالتی، کچھ کہنے کے لئے لب وا کرتی، پھر دوبارہ سر جھٹک کر اپنی پلیٹ پر جھک جاتی، جہانزیب زرمینے کے تاثرات بغور جانچ رہا تھا۔وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کشمکش میں تھی، کہے یا نہیں، جہانزیب جانتا تھا وہ زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکتی۔چند سیکنڈ بعد اس نے بی جان کو مخاطب

کیا تھا، سب کی نظریں اس پر اٹھیں، "جی بیٹا" انھوں نے نہایت اپنائیت سے جواب دیا تھا۔ "میں ایک سوال کر سکتی ہوں, "معصومیت سے آنکھیں ٹپٹپاتے ہوئے پوچھا۔ "اداکارہ"، زین بر بڑایا۔ "تم چپ رہو، تم سے مطلب, "اس نے زین کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ "پھر شروع ہو گئے تم دونوں، کیا ہر وقت انڈیا پاکستان کی طرح ایک دوسرے پر باتوں سے گولہ باری کرتے رہتے ہو، عالی نے ان کی نوک جھوک پر دلچسپ تبصرہ کیا۔ "زین، عالی بات کرنے دو نہ اسے، بی جان نے دونوں کو چپ ہونے کا اشارہ کیا، پھر زری کی طرف متوجہ ہوئیں، بی جان کو اسکے معصومانہ انداز پر بہت پیار آیا تھا۔ زری نے زین کو ٹھینگا دکھا کر چڑایا، پھر دوبارہ بات شروع کی۔ "میں نے آج سب کی آنکھوں پر ریسرچ کی تو مجھے ایک سوال چبھ رہا ہے۔ جہانزیب کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے، وہ گفتگو کا لب لباب جان گیا تھا۔ "میری آنکھیں امی سے ملتی ہیں، تانی اور نبیل کی آنکھیں چچی پر گئیں ہیں، زین نے چچا جان سے یہ رنگ چرایا ہوگا، "چور" آخری لفظ اس نے قدرے کھینچ کر بطور خاص زین کو سنایا تھا، جنگلی بلی کے لقب کا غم ابھی تازہ تھا، ٹوائن برادرز کی آنکھیں بی جان آپ سے ملتی ہیں، مگر وہ رکی، جہانزیب کی نیلی آنکھوں پر نظریں جمائیں، "جانزی کی نیلی آنکھیں، کتنی یونیک سی ہیں نہ اور مزے کی بات ہم میں سے کسی کی ایسی نہیں ہیں، بی جان کس پر گئیں ہیں؟"، "نوالہ منہ تک لے جاتے بی جان کے ہاتھ ایک دم رک سے گئے، ان کے چہرے کا رنگ بدلا، ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، زین نے اپنا سر ہی پیٹ لیا، "لو جی، زیب (جہانزیب) اب تم ہی کچھ ارشاد کرو، تمہاری آنکھوں پر جو ریسرچ ہوئی ہے "جواباً جہانزیب نے اب میں کیا کہو والے انداز میں کندھے اچکائے، "بہت اچھی ریسرچ ہے تمہاری، تم ضرور نوبل پرائز جیتو گی۔۔۔ سارے سائنسدانوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے تم نے "زین نے چاولوں سے بھرا چمچ منہ میں رکھتے ہوئے اسکا مذاق اڑایا۔ زری اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ "زیب کی آنکھیں انوکھی نہیں ہیں، ہم سے نہیں ملتیں، مطلب دادا، پردادا یا پھر آباؤ اجداد میں سے کسی پر گئیں ہوں گی، لیکن تمہیں کیسے پتہ ہوگا کبھی جو کلاس میں توجہ سے سائنس پڑھی ہو تب نہ "، اسے بولنے اور چڑانے کا نیا موقع ہاتھ لگا تھا، کیسے پیچھے رہتا۔ "زیادہ میرے دادا ابا مت بنو سمجھے "، زری نے اسے وارن کیا، ویسے بی جان میں نے بھی ایک ریسرچ کی ہے اور ابھی ابھی کی ہے "اس نے زری کی نقل اتاری، انکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ " کیا؟"، عالی اور تانیہ کو جاننے کی بہت جلدی تھی۔۔۔ زری نے ناراض نظروں سے تانی کو دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو (مل گئی ہو نہ اپنے بھائی کے ساتھ، اب آؤ تم اسائنمنٹ کے لئے) "اب دیکھیں نہ۔۔۔ ہم سب کے بال کتنے نرم و ملائم اور سلکی ہیں، خوبصورت سے "وہ مسلسل زری کا انداز اختیار کیے ہوئے تھا، اس نے بولنے کے ساتھ ساتھ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ "لیکن زرمینے ظہیر کے بال کس پر گئے ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے نوڈلز زیادہ پک گئی ہوں۔۔۔ اس نے زری کے ہلکے ہلکے گھنگریالے بالوں پر چوٹ کی۔۔۔ نہیں بلکہ ایسا لگتا ہے فون کی تاریں لٹک رہی ہوں، یا پھر جھاڑو جو ذرا سا جل گیا ہو۔۔۔ یا پھر سنہری گھاس کا ڈھیر۔۔۔ "سب کی دبی دبی ہنسی گونجی۔۔۔ "تم اسٹوپڈ۔۔۔ زری نے ہاتھ میں پکڑا چمچ اسکو دے مارا، جسے اس نے سرعت سے کیچ کر لیا۔۔۔ وہ غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔۔۔ جہانزیب نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بمشکل اپنی مسکراہٹ کو روکا تھا۔ زری غصے سے واک آؤٹ ہی کر گئی تھی۔ وہ سب دوبارہ اپنی باتوں میں مشغول ہو چکے تھے ان سب سے بے نیاز بی جان کے ذہن کے پردے پر بڑی بڑی نیلی آنکھیں چمکیں، اور وہ چمک موتی بن کر ان کی آنکھوں سے بہہ نکلی تھی، جسے انھوں نے چپکے سے دوپٹے سے پونچھ ڈالا تھا۔ (جاری ہے)

مشکلیں دنیا میں اوروں کی آساں ہوگئیں

بند کمروں میں سلگتے ہم کو صدیاں ہوگئیں

"رمضانی چچا، آیئے آیئے میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا" جمیل نے رمضانی چچا کو کھیتوں کی طرف آتے دیکھ کر کہا تھا۔ "بہت اچھی فصل ہوئی ہے، اللہ کا کرم ہوا ہے چچا؟ "اس کی خوشی دیدنی تھی، پورے سال کی محنت کا صلہ اچھی فصل کی صورت اسکے سامنے تھا۔ رمضانی چچا کو خاموش دیکھ کر وہ چونکا تھا، کھیتوں پر گہری نظر جمائے وہ گہری سوچ میں گم تھے، ان کے سامنے دو دن پہلے کا سارا منظر گھومنے لگا۔ دروازہ بجنے پر انھوں نے دروازہ کھولا تھا مگر سامنے کھڑے دو لوگوں کو دیکھ کر ان کے ماتھے پر لاتعداد شکنیں پڑیں، چہرے پر واضح ناگواری کے آثار دکھائی دیئے۔ وہ لوگ بے دھڑک اندر داخل ہو گئے تھے۔ رمضانی چچا انہیں روک بھی نہ سکے تھے۔ "دیکھو سیدھی بات کرنے آئے ہیں۔ تمہاری فصل دیکھ آئے ہیں، ریٹ وہی ہونگے پرانے، بولو منظور ہے؟؟ "اندر آتے کے ساتھ ہی ہٹے کٹے آدمی نے اپنی گھنی اور کسی حد ڈرؤانی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔ "پوچھنا کاہے کو ہے۔۔۔ جب ہمیں منظور ہے تو اسے بھی قبول کرنا ہی ہوگا۔۔۔ رمضانی چچا کے بجائے، سرخ ہیبت ناک آنکھوں والے شخص نے با آواز بلند جواب دیا، اور پھر دونوں نے تالی مار کر چھت پھاڑ قہقہے لگائے تھے۔۔۔ رمضانی چچا صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ "فصل کٹائی کے بعد ٹرک آجائے گا، تیار رہنا سمجھے؟" گھنی مونچھوں والے آدمی نے نحیف سے رمضانی چچا کو ہلکا سا جھنجھوڑا اور جوب سنے بغیر اپنے ساتھی کے ساتھ باہر کو چل دیا۔ "دیکھتا ہوں اس دفعہ کیسے لے جاؤ گے تم لوگ۔۔۔ ظالموں۔۔۔ یہ میرا حق ہے، اس پر میری دھرتی، میرے لوگوں کا حق ہے، میں مر تو جاؤنگا، مگر کسی طور تم لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچنے دوں گا۔۔۔ چاہے میری لاش سے گزر کے ہی کیوں نہ جانا پڑے۔۔۔ ان کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں تھیں، صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا، وہ بلند آواز میں چیختے رہے، یہاں تک کہ شکستہ سے زمین پر بیٹھ گئے۔۔۔۔

"رمضانی چچا..." جمیل نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے آواز دی۔ دو دن پہلے کا منظر نظروں کے سامنے سے غائب ہوا تھا۔ "آگ لگا دو فصل کو... "ان کے اگلے جملے نے جمیل کو ساکت کر دیا تھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟؟؟؟ "صدمے کے مارے اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ "میں پورے ہوش و حواس میں ہوں، آگ لگا دو اسے"، کہہ کر وہ رکے نہیں تھے۔ "چچا ایسے مت کریں"، وہ وہیں بیٹھ گیا تھا، امید کا چراغ گل ہوا تھا، اسے پوری امید تھی اس بار اچھی فصل پر اسے اچھے خاصے پیسے مل جائیں گے اور فاقوں کی نوبت نہیں آئے گی، کیونکہ حیرت انگیز طور پر اس دفعہ پچھلے کئی سالوں کے مقابلے میں پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہوا تھا مگر پھر اچانک رمضانی چچا کا یہ فیصلہ؟؟؟؟ اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں تھیں، وہ لمبا چوڑا نوجوان پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔۔ اود پھر اگلے ہی دن کھیتوں کی راکھ کے ڈھیر سے رمضانی چچا کی لاش برآمد ہوئی تھی۔ خبر حسن ہاؤس پہنچتے ہی کہرام مچ گیا تھا۔ تاجی اپنے والد کی وفات کی خبر سنتے ہی زاروقطار رونے لگی تھیں۔ گاؤں میں رہائش پذیر ہونے کی بناء پر وہ ان کے آخری دیدار سے بھی محروم ہوگئیں تھیں۔ جمیل کے فون کرنے پر انھیں پورے قصے کی خبر ہوئی تھی۔ ان کے جنازے پر فورسز کی جانب سے شدید شیلنگ کی گئی تھی۔ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں انہیں سپرد خاک کیا گیا تھا، وہ گاؤں کی مشہور و معروف ہستی میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی تدفین میں جلدی کرنے کی وجہ ان

کی مبینہ ہلاکت پر پھوٹنے والے ہنگامے تھے۔آزادی کے فلک شگاف نعرے گاؤں کی فضا میں گونج رہے تھے۔زین کی زبانی جہانزیب کو سارے واقعے کی خبر ہوئی تھی۔اس کی سماعتوں میں روتی،بلکتی،غم سے نڈھال تڑپتی تاجی کا ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا تھا۔"میرا آخری سہارا بھی چھین لیا۔۔۔کشمیر جل رہا ہے،ہم سب جل رہے ہیں،خدارا کچھ کرو ورنہ ہم سب مٹ جائیں گے..."اور نہ جانے ایسی کتنی ہی کہانیاں مقبوضہ کشمیر کی وادی میں جنم لیتی تھیں،جن کے کردار ظلم کے خلاف زینہ سپر ہو کر منوں مٹی تلے جا دبے تھے

x_______________________________________x

رات اپنے پنجے مضبوطی سے وادی کے سینے میں گاڑھ چکی تھی۔آسمان کی سیاہ چادر پر ستارے نگینوں کی مانند جگمگا رہے تھے۔گہرے سناٹے کا راج تھا،ماحول کی فسوں خیزی سے بے نیاز راہول گھاس پر دونوں گھٹنوں کے گرد بازو پھیلائے،ایک ہاتھ میں لائٹر پکڑے۔۔۔کھول بند کر رہا تھا،گہرے سناٹے کو چیرنے والی واحد آواز لائٹر کی ٹک ٹک تھی۔یہ کھیل پچھلے دس منٹ سے جاری تھا۔اس کے عقب میں قدموں کی چاپ ابھری۔

"سپاہی نور..."راہول نے ابھرتے قدموں کی چاپ سے جان لیا تھا یہ سپاہی نور کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔"یس سر"۔۔۔اس کا اندازہ درست تھا،وہ پچھلے چند مہینوں سے وادی کی گہری رات اور ان قدموں کی چاپ دونوں سے مانوس ہو گیا تھا۔"ادھر بیٹھو"۔اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے برابر بیٹھنے کو کہا،نظریں لائٹر کی مدھم روشنی پر جمی تھیں۔"تم مسلمان ہو نہ؟ ٹک کی آواز کے ساتھ لائٹر کی روشنی بجھی۔"ہاں"۔۔"پھر زندہ کیسے ہو؟..."سپاہی نے رخ موڑ کر راہول کی طرف دیکھا،لائٹر کی جلتی روشنی میں اس کی سرخ ہوتی آنکھیں حزن کی کیفیت میں ڈوبی محسوس ہوئیں۔نور نے بے اختیار نظریں چرا کر سامنے کی جانب مرکوز کر دیں۔

"خدا کی قسم،میرے ہاتھ صاف ہیں،بالکل صاف،میرا دامن کسی کی بددعاؤں سے نہیں بھرا،میں نے کبھی بھی طاقت کا استعمال کسی کمزور پر نہیں کیا"۔۔۔وہ سات پردوں میں چھپی راہول کی بات کو سمجھ گیا تھا،اس کے ہم مذہب لوگوں پر ظلم جاری تھا۔ناحق قتل کر دیے جاتے تھے،وادی میں خون کی وہ ہولی جو کئی برسوں سے کھیلی جا رہی تھی،راہول نے اس میں اس کا کردار پوچھا تھا،حصہ معلوم کرنا چاہا تھا۔"تو پھر رات کو سوتے کیوں نہیں ہو؟..."راہول کے اس وار نے اسے ڈھیر کر دیا۔کافی دیر گہری خاموشی چھائی رہی۔

"ضمیر جو جاگتا رہتا ہے،ہے نہ؟؟؟"۔۔۔وہ پورا کا پورا اس کی طرف گھوما،نور نے اثبات میں سر ہلا دیا،وہ پھیکی ہنسی ہنسا،ہاتھ میں پکڑا لائٹر بجھا کر پیچھے کی طرف اچھال دیا۔"گھبراؤ مت..."نور کو چپ دیکھ کر وہ بولنا شروع ہوا۔"تمہارا اور میرا دھرم الگ ضرور ہے مگر انسانیت تم میں اور مجھ میں اب بھی موجود ہے،جب ظلم پر دل روتا ہے،بے گناہوں کی خون آلود سفید کپڑوں میں مردہ دیکھتا ہوں۔۔۔تب۔۔۔وہ ٹھرا۔۔۔ہاں تب خود کو یہی کہہ کر تسلی دیتا ہوں۔۔۔سپاہی نور نے اپنی زندگی میں ایسا کیپٹن نہیں دیکھا تھا،یہاں جتنے بھی پوسٹ ہو کر آتے،یہاں کے ماحول میں رنگ جاتے،مگر راہول برسوں سے چھائے سرخ رنگ کو سفید کرنا چاہتا تھا،امن کا رنگ،شانتی کا رنگ پھیلانا چاہتا تھا۔۔"مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے نور...."راہول کو اپنا دکھ بانٹنے کو ساتھی مل گیا تھا،پاؤں پھیلائے،گھاس کو نوچتے ہوئے وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔"کیسا جواب..."

"یہ دنیا اس لئے بری نہیں ہے کہ برے لوگ برے ہیں، یہ دنیا اسلئے اندھیری ہوتی جارہی ہے کہ اچھے لوگ اپنی اچھائی سے برائی کو مٹاتے نہیں ہیں"۔۔۔نور کا سر شرم سے جھک گیا۔۔۔وہ مزید گویا ہوا۔۔۔
"تمہارا کردار صاف ہے،لیکن تمہارے صاف ہاتھوں سے یہاں کے باسیوں کو فائدہ نہیں پہنچا ہے، بلکہ ان کے نقصان میں تو اضافہ ہی ہوا ہے"۔۔۔وہ آہستگی سے کہہ رہا تھا،اس کا مطلب تھا وہ اسے شرمندہ نہیں کر رہا، بلکہ آگاہ کر رہا تھا۔"ہم کیا کر سکتے ہیں..."سپاہی کے سوال پر راہول اس عرصے میں پہلی بار مسکرایا تھا۔"مجھے خوشی ہے،تم نے "میں" کے بجائے "ہم" کا استعمال کیا۔تمہارے سوال کا جواب تمہارے سوال میں ہی چھپا ہے...."ہم یعنی میں اور تم۔۔۔جن کے نزدیک انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے،ہم دنیا کے اندھیروں کو اپنی اچھائی سے مٹانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں نہ؟؟؟ہم صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط تو کہہ ہی سکتے ہیں،اتنا تو کر ہی سکتے ہیں۔۔۔اس کی آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری، کہتے ساتھ ہی اس نے نور کی جانب اپنا ہاتھ پھیلایا۔اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر ایک نئے عزم کی بنیاد رکھی ،راہول اٹھا، کپڑے جھاڑے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا،نور کی نظروں نے دیر تک اس کا پیچھا کیا،سالوں سے سینے پر دھرا بوجھ ایک دم سے ہٹتا ہوا محسوس ہوا تھا

x-----------------------------------x

"نبیل،ایک منٹ رکو پلیز"۔۔۔زری نے بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے عالی اور نبیل کو روکا تھا۔"یہ کچھ نوٹس کاپی کروانے ہیں،اسائمنٹ کے لئے ارجنٹ، باہر جارہے ہو نہ"۔۔۔اس نے چند پیپرز اس کی طرف بڑھائے.
" مگر زری آپی، ہم تو اشرف (دوست) کے گھر کمبائن اسٹڈی کے لئے جارہے ہیں ؟ رات تک واپسی ہوگی ؟" نبیل نے اسے بتایا۔
"اوہو،اب کون کاپی کروادے گا؟"وہ فکرمند ہوئی۔"زری آپی لائیں میں ابھی کروادیتا ہوں"قبل اس کے، کے نبیل اپنی زری آپی کی محبت میں اور دیر کرتا اور زری اسے پیپرز تھماتی، عالی نے اسکا ہاتھ تھاما اور باہر کی جانب لپکا.
"زری، زین سیٹنگ روم میں ہے،اس سے کہہ دو،ہمیں پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے..." کہہ کر یہ جا وہ جا۔"افففف ۔۔۔اب اپنے کام کے لئے سیٹنگ روم میں بیٹھے گدھے کو بھی باپ بنانا پڑیگا؟"زین سے کہنے کا سوچ کر ہی اسے کوفت ہوئی تھی۔لیکن اسائمنٹ بھی ضروری تھا،یہی سوچ کر وہ سیٹنگ روم میں آئی تھی جہاں زین صوفے پر دراز کانوں میں ہینڈز فری لگائے موبائل کی اسکرین میں گم تھا۔"زین ؟"زرمینے نے اسے پکارا،مگر کانوں میں ہینڈز فری ہونے کی وجہ سے جواب ندارد۔"اففف،ایک تو یہ آلہ محرومی سماعت لگا کر بیٹھا ہے". زین ؟"اس نے جھنجھلا کر اس کے کان سے ہینڈفری اتارا اور پھر سے پکارا،وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔" کیا ہے؟......."
" کیا کر رہے ہو؟"۔۔۔زرمینے کے سوال پر اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورا۔" کیا احمقانہ سوال ہے؟ نظر نہیں آ رہا تھا، میں کیا کر رہا ہوں.."وہ چڑا۔
"نہیں،میرا مطلب تھا کہ تم موبائل میں کیا کر رہے ہو"۔۔۔وہ اس کے برابر میں تھوڑے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"لیکچر سن رہا ہوں سر کاشف کا۔۔کیوں پوچھ رہی ہو؟؟؟

"مجھے کچھ نوٹس کاپی کروانے ہیں اسائمنٹ کے لئے، کل تک تیار کر کے دینا ہے، پلیز کروا دو کاپی..." وہ معصومیت بھرے انداز میں کہنے لگی۔ زین نے تحمل سے اس کی بات سن کر دوبارہ سے ہینڈز فری کانوں میں ٹھونس لیے۔

"میں اس وقت لیکچر سن رہا ہوں، اہم لیکچر، مجھے ڈسٹرب مت کرو...." زرمینے نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا، ایک تو اس گدھے کو باپ بنانے کے لئے منت بھرا لہجہ اختیار کیا اور محترم کے مزاج کی نہیں مل رہے، ذرا میں بھی تو دیکھوں ایسا کون سا لیکچر سن رہا ہے، زرمینے نے ذرا سا اچک کر اس کے موبائل میں جھانکا جہاں ہولی ووڈ کی کوئی مووی چل رہی تھی، انجلینا جولی بندوق چلانے کے لئے تیار نظر آ رہی تھی۔۔۔ "اوہ، تو یہ بات ہے، اس نے اس بار ہینڈز فری تقریباً کھینچتے ہوئے اس کے کانوں سے اتارے تھے۔" کیا بدتمیزی ہے یہ؟..." زین چیخا۔ "یہ انجلینا جولی تمہیں کب سے علم کی اہمیت وفضیلت پر لیکچر دینے لگی..." اس نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔ "جھانک لیا؟؟؟ مل گیا سکون؟؟ ہونہ ال مینرڈ کی آل مینرڈ، دوسروں کے موبائل میں جھانکتے ہوئے شرم تو آتی نہیں ہے..." زین اپنا جھوٹ پکڑے جانے پر الٹا اسے ہی شرم دلانے لگا۔ "اچھا، میں آل مینرڈ، اور تمہیں جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی..." وہ کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ "نہیں"، اس دفعہ زین موبائل کو ہینڈز فری کی قید سے آزاد کر کے بآنگ دہل فلم دیکھنے لگا۔ " کام تو اس سے نکلوانا ہے، تھوڑا نرمی سے کہتی ہوں "۔۔۔ اسے ٹس سے مس نہ دیکھ کر دل ہی دل میں خود سے کہا۔

"دیکھو، تم میرے کتنے پیارے اور اچھے دوست ہو نہ، میرا کام کر دو پلیز...." اپنی تعریف وہ بھی زری کے منہ سے سننا۔۔۔ اس نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا، پھر کچھ سوچ کر پیپر اس کے ہاتھ سے لیے۔ " ٹھیک ہے میں کاپی کروا کے لاتا ہوں۔۔۔ لیکن ایک شرط پر' ..." کیا؟..."

"تم اچھی سی چائے اور فرنچ فرائز بنا دو، تب تک میں کاپی کروا کے لاتا ہوں، بہت بھوک لگ رہی ہے..." زین نے فرمائش کی۔ "اوہ، ہیلو۔۔۔ اتنا ہی ٹائم ہوتا تو خود اپنے لئے نہ بنا لیتی..." اسے اس کی فرمائش ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ "تو اب بنا لو۔۔۔ اپنے لئے اور میرے لئے"...." ہرگز نہیں، اتنا ٹائم نہیں ہے میرے پاس، ایک گھنٹا لگ جائے گا مجھے، اور اس ایک گھنٹے میں میرے دس کام ہو جائیں گے..." اب اسے زین پر غصہ آنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر، جیسی تمہاری مرضی"۔۔۔ مؤدب سے انداز میں کہہ کر اس نے پیپرز دوبارہ زری کے ہاتھ میں تھما دیے۔ "بہت ہی زیادہ بدتمیز ہو تم "۔۔۔ وہ برے موڈ کے ساتھ اٹھی، گدھا آخر باپ نہ بنا تھا، دشمن ہی رہا تھا، جانی دشمن۔۔۔

"شکریہ تعریفی کلمات کے لئے..." سر کو ہلکا سا خم دے کر اس نے تعریف وصول کی، وہ اس کی بات سے محظوظ ہوتا تھا۔

"اللہ کرے تم نے جو ڈپلومہ کے پیپر دے ہیں نہ، اس میں فیل ہو جاؤ"۔۔۔ وہ چل آگے کی جانب رہی تھی مگر گردن موڑ کر اسے بددعا بھی دے جا رہی تھی۔

"حد ہے، تم لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہوں، بددعا تو سمجھ آتا ہے، مگر تمہاری جماعت غصے میں، پہلے کی گئی دعائیں تک واپس لے لیتی ہے؟ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے، رزلٹ کل آنے والا ہے، یعنی تمہاری بددعا سے پہلے بن چکا ہوگا"

"آؤچ"۔۔۔ زرمینے کا سارا دھیان زین کی باتوں میں تھا، اسلئے اسے سیٹنگ روم کے داخلی دروازے پر بنے دو زینوں کا خیال نہیں رہا تھا، اس کا پاؤں

بری طرح پھسلا تھا؟ آہ۔۔۔زبردست قسم کی موچ آ گئی تھی، درد کی شدت سے اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔"دیکھا، دیکھا مجھے بددعا دی تھی نہ، اب پتہ چلا"۔۔۔وہ اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا، اسے زوروں کا رونا آیا تھا۔بکھرے پیپرز کو وہیں چھوڑ کر بمشکل اٹھی اور لنگڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔اپنے کمرے سے نکل کر زینے اترتے جہانزیب نے رک کر یہ منظر دیکھا تھا۔زرمینے کی آنکھوں میں چمکتے آنسو اسے دور سے ہی دکھائی دے گئے تھے۔اس نے آگے بڑھ کر سیٹنگ روم کی چوکھٹ پر بکھرے پیپرز سمیٹے تھے اور پھر زین کی طرف آیا تھا۔"زرمینے کیوں رو رہی تھی"۔۔۔وہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔" مگرمچھ کے آنسو ہونگے، اس کے آنسوؤں پر مت جاؤ، میں نے نوٹس کاپی کروانے کا کیا منع کیا محترمہ بددعائیں دینے لگی، پھر خود ہی پھسل گئی، مکافات عمل۔۔اس نے ہنستے ہوئے اسے تفصیل بتائی تھی

" کتنا تنگ کرتے ہو تم اسے، کاپی کروا دیتے، کتنی دیر لگ جاتی ..."از حد سنجیدگی سے کہہ کر زین کا جواب سنے بغیر باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

×-----------------------------------×

" کہاں، رہ گئی تھی۔۔۔فیکٹری چلی گئیں تھیں کیا"، وہ درد سے دھری ہوتی اپنے کمرے کے پلنگ پر بیٹھی تھی، تانیہ کو آتے دیکھ کر اس پر برسی۔

"تو محترمہ، کس نے کہا تھا آنکھیں ماتھے پر رکھ کر چلو تم"۔۔۔تانیہ نے کاپی شدہ نوٹس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر، ہاتھ میں پکڑا بام کھولا، اور اس کے پیر پر آہستہ سے مالش کرنے لگی۔

"یہ پیپر کس نے دیے؟؟؟"، زری نے نوٹس دیکھ کر حیرانی سے کہا۔

"اسی لئے آنے میں دیر ہو گئی، پہلے بام نہیں مل رہا تھا، پھر جہانزیب بھائی نے یہ پیپرز دیے"، مالش کے بعد اب وہ گرم پٹی باندھ رہی تھی۔"واقعی؟؟؟"، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔"ہاں، اب زرمینے بی بی آپ کام شروع کر دیں"۔۔۔

"دیکھا، ایک تمہارا نکھٹو، ناکارہ، بے مروت، بدلحاظ بھائی ہے اور ایک جانزی ہیں"۔۔۔

"بس بس، تم دونوں جیسے کو تیسا ہو"۔۔تانی کہہ کر کمرے سے غائب ہو چکی تھی۔زرمینے دھیرے سے مسکرا دی تھی۔ذہن کے پردے پر بچپن کی دھندلی یادیں ابھری تھیں، وہ ایسا ہی تھا سلجھے ہوئے مزاج کا خاموش طبع، مگر سب کی ضرورتوں سے واقف، سب کا خیال رکھنے والا، محبتیں بانٹنے والا۔۔۔"چلو کوئی تو ہے جو میرا خیال کرتا ہے، بن کہے میری ضرورت پوری کرتا ہے، وہ کھوئے کھوئے لہجے میں خود سے مخاطب تھی۔اس کے دماغ میں جہانزیب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آئیڈیا بھی آ گیا تھا۔نوٹس پر محبت و عقیدت بھری نظر ڈال کر اس نے جلدی جلدی اپنا کام شروع کر دیا تھا۔جہانزیب کو اسکا شکریہ کا نوٹ اپنے کمرے کی الماری پر چسپاں ملا تھا، جسے اس نے حیران کن مسکراہٹ سے الماری سے اتار کر ہاتھ میں تھاما تھا۔وہ بلاشبہ زرمینے کی ہی لکھائی تھی، خوبصورت لکھائی، وہ پہچان گیا تھا۔"غمک آ گور روزنہ دور"(غم آپ تک آنے کا ہر راستہ بھول جائے)۔۔۔کشمیری زبان میں اس نے خوبصورت دعا لکھی تھی"؟نوٹس کاپی کروانے کا بے حد شکریہ ..."دعا کے نیچے یہ جملہ بھی درج تھا۔اس نے غیر محسوس طور پر نوٹ پر تحریر کردہ لفظوں پر ہاتھ پھیر کر ان کی گہرائی کو محسوس کرنا چاہا تھا۔چہرے پر الوہی مسکراہٹ کھلی تھی۔سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی سے لکھے لفظوں کو اس نے دراز میں ڈال کر لاک لگا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا تھا۔اس نے زیرلب دعا دہرائی تو تھی مگر وہ یہ نوٹ نہیں کر سکا تھا کہ دعا کے اختتام پر زرمینے آمین لکھنا بھول گئی تھی اور وہ کہنا بھول گیا تھا۔

اس دیس میں لگتا ہے عدالت نہیں ہوتی

جس دیس میں انساں کی حفاظت نہیں ہوتی

کافی سوچ بچار کے بعد اس نے سر اشفاق کو ہاں میں جواب دیا تھا، انھوں نے اس کے راضی ہونے پر مطلوبہ ڈوکیومنٹس کی ایک لسٹ اسے بھیجی تھی۔ تاکہ جلد از جلد وہ فارم بھر سکیں، ان کا پیغام ملتے ہی اس نے اپنی تمام دستاویزات ایک لفافہ میں ڈالیں اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بال بنانے لگا، ساتھ ہی ساتھ وہ وال کلاک پر نظر بھی ڈالتا جاتا، بال بنانے کے بعد اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی گھڑی اٹھائی اور کلائی پر باندھتے ہوئے مڑا اور ٹھٹکا۔۔۔ دروازے پر زرمینے موجود تھی، گہرے میرون رنگ کا شلوار قمیض زیب تن کیے، سیاہ دوپٹہ سلیقے سے سر پر جمائے وہ نک سک سی تیار کھڑی تھی، گہری بھوری آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں ڈالی ہوئی تھیں، ہاتھوں میں لباس کی ہم رنگ چوڑیاں پہنے، عنابی لبوں پر نیچرل کلر کی لپ اسٹک لگائے وہ نروس کھڑی ہاتھوں کی انگلیاں چٹخ رہی تھی۔ وہ بلاشبہ حسن مجسم تھی، جہانزیب کی نگاہیں اسکی آنکھوں سے ہوتے ہوئے، ستواں ناک میں پہنی رائی کے دانے جتنی لونگ (نوز پن) پر پھسلیں تھیں، ٹیوب لائٹ کی روشنی لونگ پر پڑ کر سات رنگوں میں منعکس ہو رہی تھی۔ وہ مبہوت ہوا تھا۔۔۔

زرمینے نے اپنے پیچھے کھڑی تانی کا ہاتھ کھینچ کر اسے آگے کیا تھا۔۔۔ جہانزیب کی محویت ٹوٹی تھی۔۔۔ اس نے بے اختیار نظریں چرائیں۔۔۔ اپنی بے خودی پر دل ہی دل میں خود کو سرزنش کی، پھر پلٹ کر لفافہ اٹھایا۔

"وہ بھیا آپ کہیں جا رہے ہیں..." زرمینے کے کہنی مار کر آنکھوں میں اشارہ کرنے پر تانی نے بات شروع کی تھی۔

"ہاں سر اشفاق کی طرف اور تم دونوں؟"۔۔۔ ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی۔۔۔ ان کی تیاری دیکھ کر وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ "پچی..." اس کا جواب سن کر زرمینے بے تحاشہ خوش ہوئی تھی۔۔۔ جہانزیب کی سوالیہ نظریں اس کی جانب اٹھیں تھیں۔ "اصل میں وہ بھیا۔۔۔ آج زری کی دوست کا نکاح ہے"... "اچھا؟ تو؟..." وہ عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ "تو آپ ہمیں لے جائینگے نہ، وہ وہیں سر اشفاق کی اسکول کے آس پاس ہی رہتی ہے"۔۔۔ تانی نے اسے عجلت میں دیکھ کر جلدی جلدی یہاں آنے کا مدعا بیان کیا تھا

" گھر کے بڑوں سے پوچھ لیا ہے؟"۔۔۔ وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

"ظاہر ہے، تب ہی تو تیار ہوئے ہیں، اصل میں جانا تو ہمیں زین کے ساتھ تھا، مگر وہ لمبی تانے سو رہا ہے، اب جب تک وہ اٹھے گا، نکاح کے چھوہارے بھی بٹ چکے ہونگے..." وہ منہ بنا کر بولی تھی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن کل سے کچھ جگہوں کے راستے بند ہیں، فورسز کو تعینات کیا گیا ہے، بہتر ہوگا اگر نہ جاؤ تو"۔۔۔ اس نے بات اُدھوری چھوڑ کر ان دونوں کی جانب دیکھا۔ " کیسے نہ جائیں، اکلوتی دوست ہے میری"۔۔۔ زرمینے حسب معمول جذباتی ہوئی۔

"دیکھو! یہ رسک ہوگا، تم دونوں آج نہ ہی جاؤ تو بہتر ہے"۔۔۔ اسے یاد آ گیا تھا، کل واپسی پر سارے راستے بند تھے، اس لئے وہ اب انھیں ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ "بھیا پلیز، وہ زری کی بیسٹ فرینڈ ہے، بہت ناراض ہوگی"۔۔۔ تانی نے ضد کی۔

"حالات ٹھیک نہیں ہیں، ابو کو پتہ ہوتا فوراً منع کر دیتے، ضد مت کرو تانی"، اس نے تانی کو سمجھانا چاہا۔

"زین بھائی نے تو کل ہی منع کر دیا تھا، آپ کے پاس امید لے کر آئے ہیں اور اب آپ بھی "۔۔۔زرمینے نے ہاتھ کے اشارے سے تانی کو مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا تھا، وہ مایوس نظر آ رہی تھی، اس کی اتری صورت دیکھ کر جہانزیب کو ایک لمحہ لگا تھا اپنا فیصلہ بدلنے میں۔"اوکے فائن، چلو پھر"، اس نے زری کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے، وہ دونوں بچوں کی طرح خوش ہوئیں تھیں۔

"ایک کام کرو، تم دونوں دوپٹے کے بجائے چادر لے لو، میں باہر انتظار کر رہا ہوں"۔۔۔ان دونوں نے پھرتی سے اس کے کہنے پر عمل کیا تھا اور چند سیکنڈ کے بعد تینوں بیرونی دروازے سے اکٹھے باہر نکلے تھے۔گلیوں سے ہوتے ہوئے سیدھی سڑک پر آئے تھے، اچانک جہانزیب کے رکنے پر زری اور تانی نے ناسمجھی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔سڑک کے بیچوں بیچ سیکیورٹی اہلکار بلا وجہ وہاں سے گزرنے والے لوگوں کو روک کر چیکنگ کر رہا تھا، ایسا ناممکن تھا وہ زری اور تانی کو چیکنگ کے بغیر جانے دیتا، جہانزیب کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ وہ اپنے گھر کی عزتوں کو یوں کسی غیر مرد کے سامنے چیکنگ کے لئے پیش کر دیتا، اسی اثناء میں اہلکاران تینوں کو دیکھ چکا تھا۔

~~جہانزیب نے ایک نظر اس اہلکار پر ڈالی تھی اور دوسری نظر ساتھ کھڑیں حیران و پریشان زری اور تانی کو دیکھا تھا۔اس کے ذہن نے~~ تیزی سے کام کرنا شروع کیا، یہ ناممکن تھا کہ وہ اہلکاران دونوں پر کوئی جملہ نہ کستا یا انھیں ہوس بھری نگاہوں سے نہ دیکھتا، کتنی ہی کشمیری عورتوں، لڑکیوں کی عزتیں تار تار کی گئیں تھیں، ان کے سر سے ردائیں کھینچ لی جاتی تھیں، انھیں باور کرایا جاتا تھا کہ وہ عزت کی زندگی کے بجائے ذلت بھری زندگی تڑپ تڑپ کر گزارنے کے قابل ہیں۔وہ تیزی سے ان کی جانب مڑا، "تم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لو اور جتنی جلدی ہو سکے تیز تیز قدموں سے گھر واپس لوٹ جاؤ، یاد ہے نہ راستہ، بس پانچ منٹ کا فاصلہ ہے"، اس نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی تھی۔پیشانی اس ٹھنڈے موسم میں بھی عرق آلود ہو گئی تھی۔تانی نے اثبات میں سر ہلا کر زری کا ہاتھ تھام کر مڑنا چاہا، مگر زری جانے کے لئے آمادہ نظر نہیں آ رہی تھی۔متوحش نگاہوں سے اس نے جہانزیب کے کندھے کی اوٹ سے اس نے پاس آتے ہوئے اس اہلکار کو دیکھا تھا۔سڑک اب بلکل سنسان تھی۔اکا دکا لوگ جو پہلے موجود تھے اب وہ بھی غائب تھے۔"وہ یہیں آ رہا ہے جانزی، اس کے پاس گن ہو سکتی ہے"، خوف کے مارے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔"تم لوگ جاؤ"، جہانزیب نے سختی سے تاکید کی۔" مگر جانزی وہ۔۔۔اس کی بات منہ میں ہی رہ گئی تھی۔"زری گو ناؤ۔۔۔۔غصے سے اس نے چیخ کر زری کو آگے کی طرف دھکیلا تھا۔وہ دونوں بھاگتے ہوئے چند سیکنڈ سے کم عرصے میں نظروں سے اوجھل ہو گئیں تھیں۔اس نے بے اختیار لمبی سانس خارج کی اور پلٹا، اس کا بازو پاس کھڑے اہلکار سے ٹکرایا، وہ قدم پیچھے ہٹا، اس نے سائیڈ سے نکل کر جانا چاہا، مگر اہلکار نے اس کا بازو پکڑ کر اپنے سامنے کیا تھا۔جہانزیب کے چہرے پر ناگواری در آئی تھی۔اس نے فوراً سے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔

"ابے او سالے (گالی) کیا کر رہا تھا ہاں؟۔اس کے طرز تخاطب پر جہانزیب کو بے پناہ غصہ آیا تھا۔وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔اس نے شانے اچکائے تھے، گویا جانتا ہی نہ ہو وہ کیا پوچھنا چاہ رہا ہے۔

"مجھ سے بدمعاشی مت کر سالے (گالی)، چل تلاشی لینے دے"۔۔کہہ کر اس نے سب سے پہلے اس کے ہاتھ میں موجود دستاویزات

کو کھینچنے کے انداز میں لیا تھا۔لفافے سے پیپرز نکال کر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے اس نے ایک نظر تناؤ سے بھرپور جہانزیب کے چہرے پر ڈالی، شیطانی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی، وہ چند قدم اس کے قریب آیا۔"ویسے وہ دونوں حسینائیں کون تھیں؟؟؟، سچ میں بڑا بڑھیا مال تھا، جیسے چاند زمین پر آ گیا ہو، وہ بھی ایک نہیں دو دو۔۔۔سرگوشی نما انداز میں کہہ کر وہ مکروہ ہنسی ہنسا تھا اور جہانزیب کے ضبط کو آزما گیا تھا۔اس نے پوری طاقت سے اسے دھکا دیا تھا، وہ اس حملے کے لئے تیار نہ تھا، "تیری اتنی ہمت سالے (گالی)۔۔۔مغلظات بکتے ہوئے ایک زوردار گھونسا جہانزیب کے چہرے پر دے مارا تھا۔وہ سنبھل نہ سکا اور اوندھے میں گرا، اس کی ناک سے خون بہنا شروع ہو گیا، اپنی پوری ہمت مجتمع کر کے وہ تیزی سے اٹھا اور اہلکار پر جھپٹ پڑا، اسے پیٹ کے بل لٹا کر اس نے تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی، وہ مسلسل جنونی انداز میں اسے بوٹ کی ٹھوکریں چہرے پر مار رہا تھا، اس کے چہرے کا حلیہ بگڑ گیا تھا مگر جہانزیب کا جنون کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا، آخرکار وہ اہلکار زخمی حالت میں نڈھال سا سڑک کے بیچ نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔جہانزیب اب وہاں سے نکلنا چاہتا تھا، اس کے خیال میں وہ اسے اچھی خاصی سزا دھلائی کی صورت دے چکا ہے، مگر وہ غلطی پر تھا، اس کے چند قدم دور جانے پر اہلکار کا ہاتھ اپنی گن کی جانب بڑھا تھا، ایک لمحے سے بھی کم عرصے میں اس نے جہانزیب کا نشانہ لیا تھا اور فائر کر دیا تھا۔(جاری ہے)۔۔

زندگی کے رنگ

تحریر: صبغہ احمد

کیا آپ کو بے رنگ زندگی کا علم ہے؟؟ نہیں۔۔۔ !تو چلیں میں آپ کو بتاتی ہوں۔وقت کے پیراہن کو اوڑھ کر زندگی اپنے رنگ اخذ کرتی ہے۔ایک انسان کی زندگی اس کے اپنے نصیب اور وقت کے مطابق اسے رنگ عطا کرتی ہے۔زندگی انسان کو تقدیر کے مطابق رنگوں میں رنگتی ہے۔یہ ایک عام سا فلسفہ ہے کہ زندگی رنگ بکھیرتی ہے، رنگی رنگوں سے مامور ہے۔لیکن، انسان جب ایک نومولود کی صورت اس دنیا میں آتا ہے تو درحقیقت اس کی زندگی کورے کاغذ کی سی ہوتی ہے، بے رنگ اور سفید۔پھر وقت کے ساتھ ساتھ کورا کاغذ اپنے اندر رنگوں کو جذب کر لیتا ہے۔بالکل سیاہی چوس کاغذ کی مانند۔کہیں خوشیوں کے رنگ، کہیں اداسی کے رنگ، کہیں محبت کے تو کہیں چاہت کی دھنک زندگی میں بکھر جاتی ہے۔کبھی کسی کو پا کر چہرے پر آنے والی چمک کے رنگ تو کبھی کسی کے دور جانے سے آنے والی اداسی کے رنگ، غرض یہ کہ صبح کی سفیدی سے لے کر رات کے آسمان پر کھل جانے والی سیاہ چھتری تک اور اس کے درمیان چاند ستاروں کے رنگ، بارش کے پہلے قطرے کے رنگ جو سیپ کو موتی بناتا ہے اور سرخ پھولوں کی مسکراہٹ کے رنگ، درختوں کی بھوری چھال اور ان پر مسکن بنائے پرندوں کی چہچہاہٹ کے رنگ اور اس سے بھی کہیں آگے صحرا کی ریت کا رنگ جو کسی مسافر کی مسافت اور پیاس کا رنگ ہے تو ان تمام رنگوں سے مل کے بنتا ہے زندگی کا رنگ اور ان تمام رنگوں کو بنانے والی ذات کا رنگ یعنی اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کوئی رنگ نہیں۔۔۔

چلو اچھا ہوا تم لوٹ آئے

کشمالہ عنبرین (پنڈی)

عزت اور ذلت اللہ تعالی کی عطا کردہ ہوتی ہے۔

ہم ہر کام کیلئے اس ربِ ذوالجلال کے محتاج ہیں تو ہم کیوں خود کو اعلی سمجھنے لگتے ہیں؟

"حرا۔۔۔۔کہاں ہو حرا؟ تیار ہوگ ءہو یا نہیں؟"

اس کی ماں اسے آوازیں دے رہی تھی۔

"ضرور اپنی کتابوں میں مگن ہوگی۔ کتنی بار کہا ہے کہ تو جس علاقے سے تعلق رکھتی ہے وہاں یہ کتابیں کسی کام کی نہیں۔ اپنا پیٹ بھرنے کیلئے ناچ گانا آنا چاہیے کہ یہی ہمارا دھندا ہے ان کتابوں کی یہاں کوء قیمت نہیں " وہ لگاتار بڑبڑائے جا رہی تھی حرا اپنے کمرے میں نم آنکھوں سے اپنی کتاب میں موجود تصویر دیکھ رہی تھی۔ اس شخص کے لئے حرا نے نہ جانے کیا کیا سہا تھا۔ گھر میں ہر فرد نے طعنے دیئے تھے اور جب اس پر حرا کی حقیقت آشکار ہوء تو اس نے بھی نام نہاد عزت داروں کی طرح اسے دھتکار دیا حرا کا تعلق بازارِ حسن سے تھا۔ جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ وہ ایسے ماحول میں رہ کر بھی کہیں اور کی باسی لگتی تھی۔ یوں لگتا جیسے بھٹک کر یہاں آگ ءہو۔ طور طریقے شروع سے ہی ایسے تھے جو اسے سب میں ممتاز بناتے تھے خوبصورتی میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ اس کے نقوش میں سب سے نمایاں اس کی سبز رنگ کی آنکھیں تھیں جو دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتی تھیں۔ چہرے پر ہر وقت دھیمی سی مسکان رہتی تھی۔ دیکھنے والے اس کے سحر میں گرفتار رہتے مگر وہ اس بدنامِ زمانہ جگہ کی ہونے کے باوجود سب کی دسترس سے باہر تھی۔ اس نے اپنے بل بوتے پر اعلی تعلیم حاصل کی کیونکہ اس کی ماں اس حق میں نہیں تھی کہ وہ پڑھاء کرے یونیورسٹی کے دوسرے سال ہی وہ تیمور فاروقی کی محبت میں مبتلا ہو چکی تھی۔ اس محبت کا اظہار تیمور نے ہی کیا تھا اور " حرا " جو کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی تیمور کی شاندار پرسنالٹی کے زیرِ اثر اسے منع نہ کر سکی۔ دونوں کی یہ کوشش تھی کہ تعلیم مکمل ہونے سے پہلے وہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکیں اس لیئے دونوں کی یونی میں ہی سرسری سی ملاقات ہوتی تھی ********

دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ حرا چونک کر ماضی کی یادوں سے نکلی۔ " تجھے کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ سنا نہیں دیتا کیا؟" شہر بانو غصے سے اندر داخل ہوء۔ " کہا جو تھا تجھے کہ تیار ہو جانا آج سیٹھ دلشاد کے ہاں فنکشن ہے۔" وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گ ء۔ شہر بانو کا دل کٹ کر رہ گیا جب اس نے اپنی حسین بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وہ حرا کو پیار سے پچکارتے کر بولی۔ "میری جان! کب تک اس کا سوگ منائے گی؟ اب بس کر دے۔ کیوں بھول جاتی ہے کہ تو جس علاقے سے تعلق رکھتی ہے وہاں یہ محبت بس ایک رات کی ہوتی ہے ہمارے ہاں کی عورتیں عزت کی زندگی گزارنے کے بس خواب دیکھ سکتی ہیں کیونکہ عزت دار لوگ ہی ہمارا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ اگر اسے تجھ سے محبت ہوتی تو تیرا سچ پتہ چلنے پہ بھی تجھے چھوڑ کر نہ جاتا آج کل مرد سچی محبت تو اپنے جیسی عزت دار عورت سے بھی نہیں کرتا اور تو تو ہے بھی طوائف کی بیٹی"

حرا بولی" کیا کریں ہم ماں؟ ہمارے بس میں نہیں ہے تیمور کو بھولنا" اگر ہمارے بس میں ہوتا تو اس ہرجائی کی محبت کو دل سے نوچ لیتے مگر نہیں ہوتا ہم سے " جس دن اس کا نام نہ لیں ہم سانس نہیں لے پاتیں ہماری امید آج بھی زندہ ہے کہ وہ آئے گا ہمیں اپنانے۔" شہر بانو کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گ ءمگر

بولی تو فقط یہ کہ "اچھا چل جلدی سے تیار ہو کر آ جا سیٹھ صاحب کی گاڑی آنے والی ہو گی۔ حرا بیدلی سے اٹھ کر الماری کے پاس گ ءاور اپنا سرخ فراک نکال کر واشروم میں گھس گ ء۔ پندرہ منٹ بعد جب باہر نکلی تو لمبے بال شانوں پہ بکھرے ہوئے تھےوہ تیار ہو کر نیچے گ ء۔ تو اسے دیکھتے ہوئے شہر بانو نے سوچا کہ کاش اس کی اس حسین بیٹی کا نصیب بھی اتنا ہی حسین ہوتا لیکن یہ تو خداء کام ہیں جس کو جو نوازے مگر نام نہاد عزت دار یہ نہیں سمجھتے۔ حرا نے ماں سے کہا "اب تم کیا سوچنے لگ گئیں؟ دیکھو ڈرائیور ہارن بجا بجا کر سر میں درد کیئے دے رہا ہے۔" شہر بانو چونک کر بولی "ہاں چل چل"

حرا اپنی ماں کے پیچھے چلتی چلتی گاڑی میں بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔ شہر بانو نے بھی اسے مخاطب نہ کیا۔ گاڑی چلتے ہی ماضی کی کھڑکی کھل گ ء۔

********اس دن کسی کے گھر فنکشن تھا۔ شہر بانو نے ان سے کہہ دیا کہ میری بیٹی ناچے گی۔

حرا نے یہ سنا تو ناراض ہونے لگی۔ "ماں ہم کبھی نہیں ناچیں گے۔ ہم کبھی ایسا نہیں سوچ سکتے تو تم نے کس سے پوچھ کر ان کو زبان دی۔ تم جانتی ہو کہ ہمیں یہ سب نہیں پسند"

شہر بانو بولی "بیٹا میری خاطر کر لے آئندہ نہیں کہوں گی ان کی ضد تھی کہ تو ناچے گی۔"

حرا نے ماں کیلیئے ہتھیار ڈال دیے اور ناچنے کیلیئے تیار ہو گ ء۔ مگر نہیں جانتی تھی کہ آج اس کا دل اجڑ جائے گا وہ تیار ہو کر ماں کے ساتھ وہاں گئی نہیں جانتی تھی کہ وہ تیمور کا ہی گھر ہے تیمور ایک نسبتا سنسان گوشے میں اپنے موبائل میں بزی تھا۔ اسے اس طرح کے پروگرام بالکل نہیں پسند تھے لیکن وہ اپنے بابا جان کو منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حرا جو سرخ لباس میں مہارت سے کیے گئے میک اپ میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ لیکن اصل جھٹکا تو تیمور کو تب لگا جب وہ پرفامنس دینے کے لیے سٹیج پر آ ء۔ ۔ تیمور جو اس کی محبت میں پور پور ڈوب چکا تھا اس حقیقت نے اسے صدمے سے گنگ کر دیا کہ حرا کا تعلق بازارِ حسن سے ہےغصے کی شدید لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ اس نے اسی لمحے حرا سے ہر تعلق ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "حرا نے مجھ سے اتنی بڑی حقیقت چھپائی اب اسے پتہ چلے گا کہ تیمور کیا چیز ہے؟" اگلے دن یونی میں ملتے ہی تیمور نے اسے بری طرح دھتکار دیا۔ اور آئندہ کبھی سامنے نہیں آیا بلکہ اس نے اپنا مائیگریشن کروا لیا۔ وہ دن اور آج کا دن چار سال گزر جانے کے باوجود حرا ہر رات تڑپی تھی گاڑی جھٹکے سے رکی تو حرا نے آنکھیں کھول کر دیکھا سامنے ایک بنگلہ پوری شان و شوکت سے کھڑا تھا حرا اپنی ماں کے ساتھ اندر داخل ہو ء۔ ان کا استقبال اچھے سے ہوا۔ آج تیمور کے بزنس پارٹنر کے ہاں فنکشن تھا۔ تیمور بھی وہاں آیا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد حرا نے پرفامنس شروع کی۔ تیمور کمرے میں کسی کے ساتھ تھا اس نے ابھی حرا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ باہر آیا تو حرا سٹیج سے اتر رہی تھی۔ وہ جلدی سے اس کے پاس گیا" کیسی ہو؟"

حرا بولی۔ " جیسی بھی ہوں ٹھیک ہوں"

تیمور بولا "تم نہیں جانتی حرا میں نے یہ وقت کیسے گزارا ہے؟ ہر لمحہ تڑپا ہوں۔ پہلے مجھے لگتا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں تمہیں بھول جاں گا مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔"

تیمور نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ حرا اس کو شرمندہ نہیں دیکھ سکتی تھی تبھی اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیئے اور بولی کہ "معاف کر دیا تمہیں۔ تمہاری محبت میرے خون میں شامل ہے۔ تم سے دوبارہ دور جانے کا حوصلہ نہیں مجھ میں۔"

دل میں سوچا کہ "مجھ گناہگار کی دعائیں بھی رنگ لے آئیں اور تم لوٹ آئے لیکن تمہارے وہ تلخ الفاظ بھولنے میں مجھے وقت لگے گا۔"

دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں مستقبل کے سپنے۔۔۔۔

تبھی آتشبازی ہو ءاور وہ دونوں اس حسین منظر میں کھو گئے

دو خط

ارشد ابرار ارش

"اے میرے گوشۂ جگر

جب تم میرے خط کی یہ لائنیں پڑھو گے تو عین ممکن ہے کہ زندہ لوگوں کی فہرست سے میرا نام مٹ چکا ہوگا۔

میرے بیٹے۔۔۔

ہر والد کی طرح میری بھی یہی خواہش ہے کہ تمہارے قصیدے ہوائیں لکھیں اور آنے والے مورخ تمہارا نام بھلے لوگوں کے ساتھ لکھیں۔۔۔ آمین

سنو میرے اچھے بیٹے۔۔۔

اب جب کہ تم وقت کے ساتھ اپنی عمر کی منزلیں طے کر رہے ہو تو یقیناً تمہیں آگے چل کے بہت کچھ دیکھنا، سننا سیکھنا اور کرنا ہے۔

اور اب جب بے وفا زندگی کے طفیل تمہیں میرا ساتھ بھی میسر نہیں ہے تو میری جگہ وقت تمہیں بہت سے اسباق پڑھائے گا اسلیئے وقت کو اپنا سب سے بڑا معلم مان لینا۔

یہ معلم مزاج میں سخت گیر ضرور ہے مگر تمہاری فلاح اور بہتری اسی میں ہے کہ تم کس قدر اپنے استاد کے دیئے گئے اسباق کو دہراتے ہو اور اپنے معلم سے کیا حاصل کرتے ہو۔

چونکہ یہ معلم بے زبان ہے اس لیئے تمہیں تجربات، اشاروں اور رویوں کی زبان پر خوب دسترس حاصل کرنی ہوگی۔ ورنہ دوسری صورت میں ٹھوکریں تمہارا مقدر بن سکتی ہیں۔ اور میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ میرے بعد میرا بیٹا کبھی ایک پل کیلیئے بھی رنجیدہ ہو۔

پیارے بیٹے۔۔۔ اب سنو

تمہارے کرنے کیلیئے ایک کام چھوڑ رہا ہوں۔ کام بھاری ضرور ہے لیکن اپنی زندگی کے باقی اہم کاموں کی طرح اسے بھی ضروری جاننا

سنو۔۔۔ جب تم اپنے فہم کی بلوغت کو پا لو اور تمہیں ادراک ہونے لگے کہ اب تم داستانیں پڑھنے کے اہل ہو چکے ہو

تو تب تمہیں ایک سفر اختیار کرنا ہوگا۔ یاد رکھنا یہ سفر صرف میرے لیئے ہوگا تمہارے مرے ہوئے باپ کیلیئے۔

اے میرے جسم کے حصے۔۔۔

یہ سفر ہرگز آسان نہیں ہوگا، اس لیئے سفر کی مشکلات سے گھبرا مت جانا اور سفر جاری رکھنا۔ تمہیں معلوم ہے نا سفر انسان کو بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے یہ سفر بھی تمہیں ضرور کچھ نا کچھ سکھائے گا۔

تمہیں مغرب میں سنگلاخ پہاڑوں کی سمت جانا ہوگا۔ میرا بوڑھا سفید گھوڑا اس سفر میں تمہاری راہنمائی کرے گا وہ ان راستوں سے بخوبی واقف ہے۔ میرا سفید گھوڑا نا صرف تمہاری تھکن کم کرنے میں مددگار بنے گا بلکہ وہ ایک راہ رو کے فرائض بھی انجام دے گا۔

چار دن کے مسلسل سفر کے بعد کالے سنگلاخ پہاڑوں کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ وہیں دو پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔

گاؤں کی داخلی حدود پر تمہیں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا نظر آئے گا، نشانی یاد رکھنا جھونپڑے کی کھڑکی یا درز میں کہیں نا کہیں ایک دیا جل رہا ہوگا۔ اور جھونپڑے کے پاس ایک ٹھنڈا پہاڑی چشمہ بھی بہہ رہا ہوگا۔

پیارے بیٹے۔۔۔

وہ بوسیدہ جھونپڑا میری بیوہ کا ہے۔ ہاں حیران مت ہو بیٹے وہ جھونپڑہ میری بیوہ کا ہی ہے تمہیں وہاں جا کے میری بیوہ سے ملنا ہے۔ ان سے کچھ بھی پوچھے بغیر اس کے کتابی چہرے پر رقم ایک کہانی پڑھنی ہے اور اسے یہ سندیسہ دینا ہے کہ "اب فاتحہ بھی پڑھ لے اور دیئے کو ایک ہی پھونک سے بجھا ڈالے "

ممکن ہے تمہیں وہاں میری کوئی علامتی قبر بھی نظر آ جائے۔ ایسی صورت میں تم بھی میری بیوہ کے ساتھ میری قبر پر فاتحہ پڑھ لینا۔

میرے بھولے بیٹے

اب تم یہ سوچ رہے ہو گے کہ تمہاری ماں تو سالوں پہلے مٹی اوڑھ چکی ہے تو وہاں جھونپڑے میں کوئی عورت بیوگی کا عصا تھامے کیونکر آباد ہو گی اور میں یہاں شہر کے قبرستان میں مقبور ہوں تو وہاں دور پہاڑوں میں میری قبر کا بھلا کیا سوال۔۔۔؟

اچھے بیٹے۔۔۔ تمہیں پہلے نصیحت کر چکا ہوں کہ یہ سفر تم نے تب اختیار کرنا ہے جب تم اپنے فہم کی بلوغت پا لو اور کہانیاں پڑھنے کے اہل ہو جاؤ تب یقیناً تمہیں اپنے دونوں سوالوں کا جواب ضرور مل جائے گا

اس دعا کے ساتھ اختتام کرتا ہوں کہ

میرے اچھے بیٹے تم ہمیشہ سربلند رہو۔۔۔ آمین

تمہارا والد۔ ۔ ۔

------ ----------

عزت و احترام کے ساتھ

پیارے بابا جان۔۔۔ مجھے یقین ہے آپ کی روح وہاں صالح لوگوں کی صحبت میں ہو گی۔ ان شاءاللہ

گو کہ میرا یہ خط آپ تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا پھر بھی میں آپ کو اپنا احوالِ دل نا لکھنے پر قادر نہیں ہوں۔

بابا۔۔ آپ کے جانے کے چند دن بعد ہی میں نے آپ کی الماری میں رکھی پرانی بوسیدہ ڈائری میں اپنے نام لکھا گیا آپ کا خط پڑھ لیا تھا۔

خط اور ڈائری میں آپ کی وہی خوشبو رچی ہوئی تھی جو مجھے ہمیشہ آپ کی قربت میں محسوس ہوتی تھی۔

افسوس کہ ڈائری کے کچھ صفحات کو دیمک نے اپنی غذا کے طور پر استعمال کر لیا تھا مگر اب آپ کی باقی تمام یادوں کی طرح اب میرے

پاس آپ کی ڈائری بھی محفوظ ہے۔خط میرے نام تھا،ڈائری آپ کی بیوہ کے نام۔مگر میں خود کو وہ بوسیدہ اور کٹی پھٹی پرانی ڈائری پڑھنے سے بھی نہیں روک پایا۔۔۔ اس کے لیئے معافی کا طلب گار ہوں اور پرامید ہوں کہ آپ اپنے بیٹے کو ضرور معاف کر دیں گے ۔بابا جان۔۔۔آپ کا حکم نامہ پڑھنے کے چار سال بعد تک میں اس سفر کے بارے سوچتا رہا،ارادے باندھتا رہا،توڑتا رہا،سفر اختیار کرنے کا قصد کرتا پھر نا جانے کیوں خود ہی ترک کر دیتا۔

بابا آج آپ کو جدا ہوئے چار سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔حیران ہوں کہ میں نے آپ کے بغیر کس طرح اتنی زندگی اکیلے جی لی ہے مگر کیسے گزارے ہیں چار سال۔۔۔؟ یہ آپ کو بتا کر ہر گز رنجیدہ نہیں کرنا چاہتا۔

اور بابا میں نے اپنے سخت گیر معلم سے بھی بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔عجب مزاج معلم ہے دھکا پہلے دیتا تھا سبق بعد میں۔۔۔لیکن خوش کن بات یہ ہے کہ اب سارے اسباق مجھے ازبر ہو گئے ہیں ۔

اب جب کہ میرا قد آپ کے برابر پہنچ چکا ہے لیکن نہیں شاید آپ سے تھوڑا سا کم ہی ہوگا،اور جب مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے شعور کے زینے چڑھ رہا ہوں اور داستانیں پڑھنے کا اہل ہو چکا ہوں تو دو ہفتے پہلے میں نے ان سنگلاخ پہاڑوں کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا۔ لیکن بابا صد افسوس کہ اس سفر میں آپ کا سفید گھوڑا میرا ساتھی نہیں تھا رنج کے ساتھ آپ کو بتا دوں کے آپ کے چند ماہ بعد ہی آپ کے سفید گھوڑے نے بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر اپنی آنکھیں ہمیشہ کیلیئے موند لیں۔بہت اداس اور مغموم رہتا تھا آپ کے بعد۔ حیرت ہے کہ میں آپ کی جدائی سہہ گیا تھا شاید وہ آپ کا غم نہیں سہار پایا۔۔۔

اس سفر کا ساتھی میرا اپنا گھوڑا تھا۔چونکہ ہم دونوں ساتھی راستوں سے بالکل اجنبی تھے سو ہمارا سفر مزید طوالت پکڑ گیا اور ہمیں چار کی بجائے چھ دن سفر کرنا پڑا۔

یہ سفر واقعی سہل نہیں تھا مگر چونکہ آپ کا حکم تھا اور یہ خاص آپ کیلیئے تھا اس لیئے لازم تھا۔بابا جان۔۔۔

چھ دن بعد ہم سنگلاخ پہاڑوں میں گھرے اس گاں تک جا پہنچے۔گاں کی داخلی سرحد پر ایک خستہ حال جھونپڑے نے ہمارا استقبال کیا۔ مجھے شناخت میں زرا بھی دیر نہیں لگی کہ وہاں طاقچے میں ایک دیا جل رہا تھا۔

اجازت ملنے پر اندر داخل ہوا تو صدیوں پرانی روپہلی صورت والی بوڑھی عورت بڑے بڑے لفظوں والا قرآن مجید پڑھتی نظر آئی۔

تعارف کرایا تو انہوں نے مجھے ایک جنبش سے اپنے اندر بھینچ لیا،میرے چہرے کے بوسے لیتی رہیں،اپنے خشک ہونٹوں سے میری آنکھیں چومتی رہیں،بار بار میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر جانے کیا محسوس کرتی تھیں وہ۔

مجھ سے میرے سفر اور امی جان کا احوال پوچھا،مجھے وہاں جھونپڑے میں بٹھا کر پاس بہتے پہاڑی چشمے سے ٹھنڈے پانی کا کٹورا بھی بھر لائیں۔ چشمے کا پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا مجھے یقین ہے اس پہاڑی گاں کے باقی لوگ بھی چشمے کے پانی اور آپ کی بوڑھی بیوہ کی طرح میٹھے اور خالص ہوں گے۔

کتابی چہرے والی وہ بوڑھی عورت امی جان کا سن کر اداس ضرور ہو گئیں،مگر بابا ایک بار بھی ان کی زبان پر آپ کا نام تک نہیں آیا۔۔۔

اور بابا جب میں نے آپ کا پیغام سنایا تو وہ وہیں مر گئیں، مگر وہ مری نہیں تھیں وہ زندہ تھیں جانے کیوں مجھے ایسے لگا جیسے وہ مرگئی ہوں،
اس معمر عورت کے تبسم میں کھلے ہوئے لب باہم پیوست ہو گئے اور اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے دو قطرے ٹوٹ کر گرے جوان کے
پیاسے دامن نے پی لیئے۔

وہ کتنی ہی دیر بے حس و حرکت چپ چاپ بیٹھی رہیں جیسے کسی نے ان کی قوتِ گویائی سلب کر لی ہو۔ میں انہیں کندھے سے جھنجھوڑ کر
جھونپڑے میں واپس لایا۔

پھر وہ اٹھیں، غیر متوازن اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی دیئے تک پہنچیں اور ایک ہی پھونک سے وہ ٹمٹماتا ہوا دیا بجھا دیا۔

بابا۔۔۔ ہمارے پاس بولنے کیلئے اب کچھ بھی نہیں تھا سو ہم دونوں کتنی ہی دیر چپ بیٹھے رہے، میں نے فرصت کے اس دورانیے میں ان
کے کتابی چہرے پر لکھی داستان پڑھ لی۔ ہاں بابا میں ساری کہانی جان گیا ہوں۔

میں نے اس بوڑھی عورت، جھونپڑے اور دیے کے علاوہ بھی وہاں بہت کچھ محسوس کیا۔ بابا یہ وہ احساسات تھے جنہیں میں الفاظ کے
ملبوسات دے کر بے وقعت نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میں انہیں بیاں کرنے سے قاصر ہوں۔ آپ یہ سب بخوبی جانتے ہوں گے۔

پھر میں اٹھ کے وہاں آپ کی قبر تلاش کرنے لگا۔

لیکن بابا وہاں آپ کی کوئی قبر مجھے نظر نہیں آئی نا اندر نا ہی جھونپڑے کے باہر۔ میری متلاشی نگاہوں کو آپ کی بوڑھی بیوہ بھانپ گئیں
اور بتایا کہ مجھے آپ کی قبر کہیں نہیں ملے گی کیونکہ وہ انہوں نے اپنے دل میں بنا رکھی ہے۔

بابا میں واپسی کیلیئے گھوڑے پر بیٹھا اور گاں کی سرحد پار کر آیا مگر دو بوڑھی مس تظر آنکھیں دور تک مجھے اپنی پشت پر چبھتی رہیں۔

اور ہاں مجھے میرے دونوں سوالوں کے جواب بھی مل گئے ہیں لیکن میں اب گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہوں، میں فرق نہیں کر پا رہا کہ میں
خوش ہوں یا افسردہ۔۔۔

بابا جان۔۔۔ میں نے آج پھر اپنا رختِ سفر باندھ لیا ہے۔

اب جب میں یہاں تنہا جی رہا ہوں اور وہاں دور پہاڑوں میں آپ کی بوڑھی بن بیاہی بیوہ کا بھی یہی قصہ ہے۔ تو میں نے آپ کی بیوہ
کے ساتھ ہمیشہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ باہر میرا گھوڑا میرا منتظر کھڑا بار بار مجھے بلا رہا ہے شاید اسے بھی آپ کی بیوہ سے محبت ہو گئی ہے۔

یہ خط مکمل کر کے میں آپ سے ملنے آں گا، پھر فاتحہ پڑھ کے مجھے دور سنگلاخ پہاڑوں کے سفر پر نکلنا ہوگا، آپ کی بن بیاہی بوڑھی بیوہ
کے پاس

خدا کرے آپ کی روح کو ہمیشگی کی راحت نصیب ہو۔ آمین

آپ کا بیٹا

جو آج سے آپ کی بیوہ کا بھی بیٹا ہے۔

دو کلومیٹر

صداقت حسین ساجد

کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔

شہر سے گھر واپس آتے ہوئے اپنے گاں کے ایک بندے کو دیکھا، وہ موٹر سائیکل گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر پوچھا۔

" کیا ہوا؟ "اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"پٹرول ختم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ "

میں حیران رہ گیا کہ پٹرول پمپ کے پاس تو وہ کھڑا تھا اور اس کا ارادہ لگ رہا تھا کہ وہ اس پٹرول پمپ پر نہیں جائے گا۔ مجھے شک ہوا کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پھر بھی میں نے پوچھا۔

"پٹرول پمپ کے پاس تو کھڑے ہو۔۔۔ یہاں سے ڈلوا لو۔۔۔ "یہ سن کر اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا اور کہنے لگا۔

" نہیں۔۔۔۔۔یہاں سے نہیں ڈلواں گا۔۔۔۔۔ "

"وہ کیوں۔۔۔۔اگر پیسے نہیں ہیں، تو میں دے دیتا ہوں۔۔۔۔ "

اس نے تیزی سے میری بات کاٹی اور بولا۔ "پیسے ہیں، لیکن مسئلہ اور ہے، اس لیے میں یہاں سے پٹرول نہیں ڈلوا سکتا۔۔۔۔۔ "

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "مسئلہ۔۔۔۔۔کیسا مسئلہ؟ "

"یہ شیل کمپنی کا پٹرول پمپ ہے اور تمھیں پتا ہے کہ یہ ہالینڈ کی کمپنی ہے۔۔۔۔۔اگلے دن مجھے کسی نے شیل کمپنی کا نشان دکھا کر بتایا ہے کہ اس کمپنی کے ملک کے ایک باشندے نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گستاخانہ خاکوں کا مقابلہ منعقد کرانے کا پروگرام بنایا ہے۔۔۔۔۔اب بتا !میں یہاں سے پٹرول کیسے ڈلواں؟ "

اس کی بات نے مجھے حیران کر دیا کہ ایک ان پڑھ بندی بھی اتنا شعور رکھتا ہے۔ میں نے اسے جانچنے کے لیے کہا۔

"دیکھو !اگلا پٹرول پمپ دو کلومیٹر کے بعد ہی آئے گا اور راستے میں کسی دکان سے بھی نہیں ملے گا۔۔۔۔مجبوری ہے، تم یہیں سے ڈلوا لو۔۔۔۔ "اس نے تیزی سے کہا۔

" کل قیامت والے دن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرما لیا کہ تم دو کلومیٹر بھی نہیں چل سکتے تھے، تو بتا !میرے پاس کیا جواب ہو گا۔۔۔۔۔۔ "

اتنا کہہ کر وہ مجھے ہکا بکا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

حقیقت کا سفر

غزالہ سکندر

"میری زندگی میں کوئی بڑا مقصد ہی نہیں ہے "-ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھ دیکھ کر وہ روہانسی ہو کر بولی"-بڑے مقصد سے تم کیا مراد لیتی ہو؟
"میں اپنے ساتھ ساتھ لوگوں کو بھی بدلنا چاہتی ہوں .. میں ہانیہ حسین ایک Failure نہیں بننا چاہتی"-
" کس نے کہا تم Failure ہو "..ثمر کی بات پر اس نے چونک کے اسکی طرف دیکھا-
"اگر تم غور کرو تو تمہارا مقصد , مقصدوں میں سے عظیم ہے -اپنے ساتھ دوسروں کا غم کرنے والے , انکو بدلنے کی نیت رکھنے والے عام لوگ نہیں ہوتے ..اور تمہاری کوشش بھی عام لوگوں سے زیادہ ہونی چاہیے جو ہر دن تمہیں تمہارے مقصد کے قریب تر کر دے "-
ثمر کی بات پر اس کے چہرے پہ مایوسی چھا گئی" -میرا ماضی میری ہر کوشش کے سامنے ایک مضبوط دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے ..اتنی مضبوط دیوار جس کے سامنے مجھے اپنا آپ اور اپنی تمام تر کوششیں بہت حقیر معلوم ہوتی ہیں "-
"دیکھو ہانیہ ماضی کو ہمیشہ شرمندہ ہونے کیلیے یاد نہیں کیا جاتا --ماضی بھلایا نہیں جا سکتا بلکہ اس کو اپنی یادداشت کے سب سے اوپر والے خانے میں رکھا جاتا ہے تاکہ ہر اٹھتے قدم پہ اس سے سبق لیا جا سکے -اسے خود کو تکلیف دینے کیلیے نہیں بلکہ ایک چیلنج کی طرح لو کہ اب تمہیں ماضی نہیں دہرانا" --
ثمر کے یہ الفاظ اس کی سوچ کا ایک نیا در وا کر رہے تھے اور اس کا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں ڈوبتا جا رہا تھا....
"ہانیہ , بیٹا اب اٹھ کے پڑھ لو صبح تمہارا پیپر ہے "-انیسہ بیگم نے اسے مسلسل فون پر مصروف دیکھ کر ٹوکا-
"جی امی یہ میں بس خاور سے اس کی تیاری ہی کا پوچھ رہی تھی"-
خاور نہ صرف ہانیہ کا منہ بولا بھائی تھا بلکہ کلاس فیلو بھی تھا اور دونوں میں انتہا کی ہم آہنگی تھی ..دونوں اب فرسٹ ائیر میں تھے اور کوئی بھی دیکھنے والا ان کو سگا بہن بھائی ہی سمجھتا تھا کیوں کہ ان کی عادات واطوار ایک جیسی تھیں -خاور کا کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا اس لیے اس کے ہر خانے میں ہانیہ ہی تھی , بہن , بھائی , دوست اور بوقت ضرورت امی ابو بننے میں بھی دیر نہیں لگاتی تھی ..ہانیہ کے اس کے علاوہ ایک بہن اور بھائی تھے وہ چونکہ کافی چھوٹے تھے اس لیے وہ انکی نسبت خاور کے ہی زیادہ قریب تھی-
"یار کتنی تیاری ہو گئی ہے ؟ یہ کیمسٹری آخر مر کیوں نہیں جاتی"-
وہ پڑھ رہی تھی جب اسے خاور کا پڑھائی سے بیزار میسج موصول ہوا-
"میرے پاس ابھی یہ فضولیات سوچنے کا وقت نہیں ہے -اب خود بھی انسانوں کی طرح پڑھو اور مجھے بھی پڑھنے دو"-
"نہیں پڑھا جا رہا ناں " -وہ
جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا" .. کوئی تعویذ گھول کے کیوں نہیں پلا دیتی مجھے -بڑی بہن ہونے کا کوئی حق تو ادا کرو "-

"بڑی بہن ہونے کا حق ہی ادا کر رہی ہوں - تمہیں, خاور , کسی اور کے اندر مسیحا تلاش کرنے کی بجائے وہ روپ اپنے ہی اندر کھوج کر نکالنا ہوگا) "- کہاناں وہ ماں بننے میں دیر نہیں لگاتی تھی(

"او کے - " یک لفظی جواب موصول ہونے پر وہ جانتی تھی کہ اب وہ پڑھنے بیٹھ چکا ہوگا-

لیکن تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ موبائل سکرین اس کے نام سے پھر جلنے بجھنے لگی ..

"اب یہ مرے گا میرے ہاتھوں ", بڑبڑاتے ہوئے اس نے فون کان سے لگایا ..

"صرف تیس دن بڑی ہو اور رعب جھاڑتے وقت خود کو میری ماں کے سکول کی پرنسپل سمجھنے لگتی ہو "-

"اب 'ب ' سے بک بک نہ کرو اور مدعے پہ آ "-

"اگر میرا کل کا پیپر اچھا ہو گیا تو بدلے میں کیا ملے گا " ؟وہ لالچی ہوا-

"پھر کل کا لنچ میری طرف سے "-

"اللہ مجھ جیسے ہر غریب کو تمہارے جیسی امیر ماں ---اس کی زبان پھسلی , آ میرا مطلب ہے,بہن دے "..جواب سنے بغیر ہی فون ٹھک سے بند ہو گیا .. اور وہ مسکراتے ہوئے کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی

پیپر کے فوراً بعد وہ اس کے سر پر سوار ہو گیا" -میرا پیپر تو بہت اچھا ہو گیا ہے اب تم لنچ پہ لے جانے کی تیاری پکڑو"-

" کون سا لنچ "?وہ آنکھیں پٹپٹا کے اسے دیکھنے لگی ..

"اس بار تم پھر مکری تو میں آئندہ کوئی پیپر اچھا نہیں دوں گا"-

"اب کیا تم بہن کے پیسوں کا کھاتے اچھے لگو گے" ?

"بڑی بہن "-اس نے تصحیح کی ..

"لیکن بھائی تو چھوٹے بھی بڑے ہی ہوتے ہیں ناں "..وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی-

اور تھوڑی دیر بعد ہمیشہ کی طرح وہ ہی اس کو کھلانے لے جا رہا تھا .. یہ ان کا ہر بار کا معمول تھا -یہی دستور تھا----

وہ عصر پڑھ کے فارغ ہی ہوئی تھی جب انیسہ اس کے کمرے میں چلی آئیں" , بیٹا فرحانہ بیگم تم سے ملنے آئی ہیں"-

" کیوں امی خیریت" ?

" کیوں اب کیا انکے یہاں آنے کیلیے بھی کسی وجہ کا ہونا ضروری ہے "?انیسہ بیگم کا غصہ بھی مرضی کا مالک تھا..

"ارے نہیں امی میرا وہ مطلب نہیں تھا میں مل آتی ہوں آنٹی سے "-وہ بات کا اثر زائل کرنے کیلیے اٹھ کھڑی ہوئی-

"السلام علیکم آنٹی "!ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی وہ بولی اور ان سے مل کر ساتھ ہی بیٹھ گئی .. ان کو دیکھ کر اسے اپنا آپ مزید مجرم لگنے لگا تھا -وہ غیر آرام دہ سی بیٹھی ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی..

"ہانیہ بیٹا میں بھی تو تمہاری ماں ہی ہوں اپنی اس ماں کو اتنی جلدی بھول گئیں "..وہ شکوہ کیے بنا نہیں رہ سکیں-

"ارے نہیں آنٹی اصل میں آج کل مصروفیت کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے لیکن آپ کو تو پھر بھی روز یاد کرتی ہوں "-

" پھر آج چلو میرے ساتھ "..وہ بڑے مان سے بولی تھیں

ان کی بات پر وہ بس مسکرا کر رہ گئی کیوں کہ وہ انکا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی اور دوسری طرف وہ بھی جانتی تھیں کہ وہ نہیں جائے گی -

"بیٹا اتنی پابندیوں کی بیڑیوں میں مت الجھا خود کو "..تھوڑی دیر بعد وہ ہی بولنے لگیں" .. تمہارے گھر میں میرا بیٹا آ نہیں سکتا اور ادھر آنا تم نے خود پر حرام کرلیا ہے -اتنی تکلیف مت دو خو کو .. تھوڑی سی گنجائش تو چھوڑ دو میری جان"-

"آپ کو کس نے کہا آنٹی میں تکلیف میں ہوں "? وہ ان کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی" .. جہاں کوئی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی وہاں میں کیسے نکال سکتی ہوں -مجھے چیٹنگ اور شارٹ کٹس بالکل پسند نہیں ہیں ..اور یقین جانیں میں بہت مطمئن ہوں "--وہ مسلسل نیچے دیکھ رہی تھی-

"جیسے وہ میرا بیٹا ہے ویسے ہی تم میری بیٹی ہو تم مانو یا نہ مانو .. میری طرف سے تم پہ کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہوگا "-وہ اس سے زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کرسکتی تھیں اور اس سے زیادہ کی اسے تمنا بھی نہیں تھی-

ان کے جاتے ہی انیسہ بیگم کا پارا مزید شوٹ کر گیا" ..اتنی سخت دل مت بنو ہانیہ -وہ بچہ میری آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا ہے .. تمہارے ناز نخرے اٹھاتا نہیں تھکتا تھا اور اب تمہاری ذرا سی بیوقوفی اور بلاوجہ کی ضد کی وجہ سے کملا گیا ہے "-وہ بلا تکان بولتی جا رہی تھیں" -اور تم وہی ہو ناں جو کچھ دن پہلے تک دن رات کی تفریق بھلائے اس سے راز و نیاز میں مصروف نظر آتی تھی اور اب اچانک کون سا کیڑا دماغ میں گھس گیا ہے کہ اچانک اس سے قطع تعلق کر کے بیٹھ گئی ہو ؟جب مجھے تمہاری ماں ہو کے کوئی قباحت نظر نہیں آتی تو تم میں اتنی دقیانوسی سوچ کہاں سے آ گئی ہے آخر "-

انیسہ بیگم کی اس قدر صاف گوئی پر اس کی آنکھوں میں پانی کا ایک سیلاب آ ٹھہرا تھا .. کم از کم ماں سے اسے یہ توقع ہرگز نہیں تھی -وہ اتنی دیر سر جھکائے بیٹھی رہی کہ انہیں یقین ہو گیا اب وہ نہیں بولے گی -

جب اس نے سر اٹھایا تو اسکے چہرے پہ کرب کا ایک جہاں آباد تھا" ..امی "! بھیگی آواز میں وہ بولی" - کچھ روز پہلے تک میں نا سمجھ تھی نادان تھی -میری ڈکشنری میں 'سب صحیح ہے ' کا کنسپٹ تھا تب آپکی ذمہ داری تھی کہ آپ میری انگلی پکڑ کے سیدھی راہ دکھاتیں ,پیار سے سمجھاتیں ,ڈانٹتیں ہر حربہ آزماتیں لیکن آپ نے مجھے نہیں بتایا اور میں اس انجان راستے پہ منزل ڈھونڈتی رہی جہاں میرے لیے گڑھوں کیسوا کچھ نہ تھا "-انکی نظروں کی تپش کو نظر انداز کیے وہ بولتی جا رہی تھی" -- لیکن اب چونکہ میں سمجھ بوجھ رکھتی ہوں تو میرے کسی عمل کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہوگی میں اپنے ہر اچھے برے عمل کی جوابدہ خود ہوں گی -اگر میں اب بھی انہی راہوں کی مسافر رہی تو وہ گڑھے ہمیشہ کیلیے میرا مقدر بنا دیئے جائیں گے اس لیے امی ,اگر میں اپنے بھٹکے ہوئے وجود کو سیدھے راستے پہ ڈالنے کی سعی کر رہی ہوں تو پلیز میرے لیے رکاوٹ مت بنیں "-اس کی آواز بھیگتی جا رہی تھی" -اس بار مجھے ناکام ہونے سے بچا لیں -مجھے دشوار راستے بھی قبول ہیں بشرطیکہ وہ مجھے میری منزل کا پتا دے دیں -میں آپکا دل بھی نہیں دکھانا چاہتی لیکن میں اسی ٹوٹے

پھوٹے لیکن سیدھے راستے پہ قائم رہنا چاہتی ہوں "--بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی تو وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی--

وقت کیسے پر لگا کر اڑ گیا اس کا احساس انہیں یونیورسٹی جانے کے بعد ہوا ..

ان دونوں کے معمولات اب بھی وہی تھے .. لیکن اب ڈیپارٹمنٹس مختلف تھے .. ہانیہ فائن آرٹس میں جا چکی تھی اور خاور آئی ٹی میں ..

لیکن ابھی بھی دونوں اکٹھے ہی آتے جاتے تھے...

یونی کے پہلے دن ہی ہانیہ کی ملاقات ثمر سے ہوئی اور یہاں سے انکی دوستی کی شروعات ہوئی .. دونوں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہونے کے باوجود خاصی خوش مزاج تھیں .. اور یہاں سے ہی ہانیہ کی تبدیلی کا دور شروع ہوا-

یونی میں بھی ان کی چھیڑ خانیوں کا وہی معمول تھا جبھی ایک دن ثمر نے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا" .. ویسے خاور اور تم جڑواں (twins) ہو کیا ? حرکتیں تم دونوں کی ملتی ہیں لیکن شکلیں نہیں "-اور خود ہی اپنی بات کا لطف لیتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگی -

" نہیں میں اس سے بڑی ہوں "

"اچھا واقعی ? لگتی تو نہیں ہو .. کتنا بڑی ہو?"

" تیس دن "اس نے بے توجہی سے جواب دیا-

"ایں ? تیس دن"?

"وہ میرا سگا بھائی نہیں ہے یار لیکن سگوں سے بڑھ کر ہے "-

اب کے ثمر کچھ سنجیدہ ہوئی تھی" -اگر وہ سگا نہیں ہے تو پھر وہ بھائی بھی نہیں ہے"-

Just stop it here Samar.

وہ ناگواری سے بولی-

"اوکے "ثمر کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں سنے گی-

----

"ہانی آج واپسی پر ہم مووی دیکھنے چلیں گے "

"ارے یار کوئی بہانہ نہیں "وہ اسکی شکل دیکھتے ہی بولا" یہ دیکھو میں ٹکٹس بھی لے آیا ہوں اور امی اور آنٹی کو بھی بتا آیا ہوں کہ ہمیں واپسی پر دیر ہو جائے گی"

"اوکے ڈین "وہ خوشدلی سے مسکرائی تھی -

"خاور تمہارا فون کب سے بج رہا ہے "وہ اٹھاتے ہوئے بولی .. لیکن سکرین پر ایک لڑکی کی تصویر دیکھ کر وہ رک گئی اور نام پڑھنے لگی ..

RIDA

"یہ ردا کون ہے خاور ؟وہ نارمل انداز میں بولی..

"ہاں یار دوست ہے"

"تو اب تم لڑکیوں کو بھی دوست بنانے لگے ہو "-

" کیوں اس میں کیا قباحت ہے " ؟وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا..

"ہے قباحت , ہم سکون سے زندگی گزار رہے ہیں اس میں ہلچل پیدا مت کرو ..ان چکروں میں مت پڑو یار "

"وہ بہت اچھی ہے ہانی , کل ملواں گا تمہیں اس سے , سارے تحفظات ختم ہو جائیں گے تمہارے"

وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی-

اور اگلے دن وہ موصوف واقعی ردا کو لے کر اس کے ڈیپارٹمنٹ پہنچ گئے -

"ردا ان سے ملو , یہ ہیں میری " Buy 1 get 1 free ہانیہ کی گھوریوں پر نظر پڑتے ہی بولا "میرا مطلب تھا یہ میں بہن ہیں اور بوقتِ ضرورت ماں بننے کا فریضہ بخوبی انجام دیتی ہیں "

اس کی باتوں پر وہ زبردستی مسکرا رہی تھی ..اور ردا سے مل کر وہ واقعی مطمئن ہو گئی تھی کیوں کہ وہ بہت ملنسار تھی-

----

اب اکثر ردا ان کے ساتھ ہی گھر بھی جانے لگی تھی -دونوں گھروں میں ان کی نوک جھونک سے رونق تو پہلے بھی لگی رہتی تھی لیکن اب ردا کا آنا ایک اچھا اضافہ ثابت ہوا تھا -سب سے زیادہ مثبت تبدیلیاں خاور کی ذات میں سب محسوس کر رہے تھے ..یہ تبدیلی جہاں خاور کو چہکا رہی تھی وہیں ہانیہ کو خاموشی سے کملا کے رکھ گئی تھی --خاور کے زیادہ تو معاملات میں ہانیہ کی بجائے ردا کا عمل دخل رہنے لگا تھا-وہ اسے کسی معاملے میں بلانے کی کوشش بھی کرتا تو وہ بس ہوں ہاں کر کے رہ جاتی-

---------****

"ہانیہ کیا ہو گیا ہے یار "؟ثمر اس کی مسلسل خاموشی سے اکتا کر بولی تھی-

"خاور اب ردا کے زیادہ قریب ہو گیا ہے"

"تو "؟ ثمر سمجھ رہی تھی لیکن وہ اسے بولنے دینا چاہتی تھی-

"وہ خاور جو کل تک اپنی ٹائی کا کلر بھی میرے بغیر سلیکٹ نہیں کر سکتا تھا آج اپنے بڑے بڑے فیصلے میرے بغیر کرنے لگا ہے "وہ روہانسی ہو رہی تھی-

"اب تم لوگ بڑے ہو گئے ہو ہانیہ -اسے اپنی زندگی میں آگے بڑھنا ہے -اور تمہیں بھی - تم دونوں کی ترجیحات بدلیں گی-معاملات پر سمجھوتہ کرنا سیکھو "-اسکا انداز سمجھانے والا تھا-

"میں اس پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر سکتی "-اس کا لہجہ قطعی تھا -

پھر ثمر نے جواباً جو کچھ کہا وہ اسے جھنجھوڑنے کیلیے کافی تھا--

----

چار دنوں سے ہانیہ کو سخت بخار تھا اور خاور گھر , یونی اور ہسپتال کے درمیان گھن چکر بنا ہوا تھا-

"یار ہانی اب بس بھی کرو کیا جوگ لے کر بیٹھ گئی ہو - جلدی سے ٹھیک ہو جا بڑی گپیں لگانی ہیں "-

وہ بمشکل مسکرا پائی تھی -آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے , زرد رنگت , روکھے بال .. چار دنوں نے ہی اسے نڈھال کر دیا تھا-

جب اس کی طبیعت سنبھلی تو اسے گھر لے آئے اور اگلے ہی دن سے وہ یونی بھی جانے لگی تھی-

----

خاور اس کے ساتھ کافی وقت گزارنے لگا تھا لیکن وہ کم گو ہو گئی تھی .. وہ اس کی طبیعت کا سوچ کر خاموش ہو جاتا-

وہ دونوں بیٹھے تھے جب ردا کا میسج آیا .. وہ اس کو ریپلائے کرنے ہی والا تھا جب وہ آپے سے باہر ہو گئی" -یہ کیوں ہر وقت تمہارے پیچھے پڑی رہتی ہے "?

" کیا مطلب "? وہ الجھا-

"مجھے اچھا نہیں لگتا وہ تمہارے ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتی ہے "وہ دلبرداشتہ ہوئی بیٹھی تھی-

"لیکن مجھے اچھا لگتا ہے اس کا ایسے کیئر کرنا "-

"تم میری جگہ اس کو دے رہے ہو , تم بس اس سے دور رہو "-وہ ضدی ہوئی-

"میں اسے اسکی جگہ ہی دے رہا ہوں - تم بہن ہو بہن بن کر رہو -اور یہ کون سے حق جتا رہی ہو تم مجھ پر -یہ تمہارے نہیں ردا کے حق ہیں کیوں کہ میں اس سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں "-

اور یہ بات ہی اسے توڑ دینے کیلیے کافی تھی -وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی اسے لگ رہا تھا خاور نے اسے بھرے بازار میں بے آبرو کر دیا ہے -وہ اسی حالت میں قدم قدم پیچھے ہٹنے لگی -

تب ہی خاور کو اپنے الفاظ کی سنگینی کا احساس ہوا" -یار ہانیہ رکو -میرا وہ مطلب نہیں تھا -پلیز رکو "-

لیکن وہ سنی ان سنی کرتی ہوئی وہاں سے بھاگتی چلی گئی-

کمرے میں جاتے ہی وہ تکیے میں منہ چھپا کر رو دی -اسے ثمر کی باتیں یاد آ رہی تھیں-

" کیا تم اسے واقعی بھائی سمجھتی ہو ہانیہ "?

" کیا مطلب ہے تمہارا ثمر "? وہ ایک دم آپے سے باہر ہوئی-

ریلیکس .. ثمرآہستگی سے بولی " -انسان سمجھوتہ اسی پر نہیں کر سکتا جس کیلیے اسے کوئی Insecurities ہوتی ہیں -اور بھائی کیلیے تو کوئی Insecure نہیں ہوسکتا ناں "-وہ رکی , جھجھکی -ہانیہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی -ساکت جامد .. یہ ثمر کس حقیقت سے پردا اٹھانے جا رہی تھی " -دیکھو ہانیہ تم پڑھی لکھی ہو , سمجھدار ہو .. اگر ایسے ہی کہہ دینے سے کوئی بھائی بن جاتا ہے تو یہاں سے گزرتے ہوئے کسی بھی لڑکے کو اگر میں شوہر کہہ دوں تو کیا وہ میرا شوہر ہو جائے گا "?

" نہیں ناں " ثمر اس کی ویران ہوتی آنکھیں دیکھ رہی تھی لیکن اس نے بات جاری رکھی " -اگر اللہ نے اسے تمہارا بھائی بنانا ہوتا تو تمہارے گھر میں ہی پیدا کرتا ناں ----اس کے ساتھ تو تمہاری شادی بھی جائز ہے اور کیا بھائیوں کے ساتھ کوئی شادی کرتا ہے "?

تب غصے میں وہ آپے سے باہر ہو گئی تھی لیکن اب ایک ایک حرف پر اس کا دل ایمان لا رہا تھا -وہ مزید شدت سے رونے لگی تھی -وہ کیا کر رہی تھی - کیا کرتی آئی تھی -ثمر کے الفاظ پھر سے کانوں میں گونجنے لگے تھے " -مجھے سمجھ نہیں آتا ہانیہ کہ ہم صرف بھائی کے رشتے کو ہی کیوں بلا سوچے سمجھے حیلے بہانوں سے باہر ڈھونڈتے پھرتے ہیں -منہ بولا بھائی - کبھی اس لفظ پر بھی غور کیا ہے -بولتے ہوئے بھی شرم آتی ہے -ان توہمات سے اب نکل آ -خود کو اس کے بغیر ایک ٹریک پر ڈال واب "-اور اب وہ سوچ چکی تھی اسے اس ڈور سے خود کو آزاد کر لینا ہے -خاور کے پہنچنے تک وہ بہت سے فیصلے کر چکی تھی -وہ اپنے دل پر پہلا قدم رکھ چکی تھی .. وہ جانتی تھی ابھی اسے بہت بار ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہونا پڑے گا لیکن وہ دوبارہ جوڑے گی خود کو -------

"ہانیہ دروازہ کھولو یار -آئی ایم سوری میرا وہ مطلب بالکل نہیں تھا "-لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی -انیسہ بیگم بلانے آئیں تو اس نے اس سے ملنے سے صاف انکار کر دیا -

اگلے دن وہ پھر آ پہنچا تھا جب ہی وہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر نکلی تھی " -خاور صاحب کیا ہی اچھا ہو جو آپ اپنے گھر رہا کریں یہاں آنے کی زحمت مت کیا کریں "-

"ہانیہ یہ کون سا طریقہ ہے بھائی سے بات کرنے کا "-انیسہ بیگم ٹوکے بغیر نہ رہ سکیں-

"بھائی "?-وہ استہزائیہ ہنسی -لیکن دل لہو رو رہا تھا " --بھائی نہیں ہے یہ میرا امی -بھائی میرا ایک ہی ہے اور وہ چھوٹا ہے "-

"یہ کیا بکواس کر رہی ہو "وہ گرجا تھا -

" تمہیں بکواس لگ رہا ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتی جو رشتہ اللہ نے تمہارے ساتھ نہیں بنایا تو میں کیسے بنا سکتی ہوں "?

انیسہ بیگم کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ انہیں ہاتھ اٹھا کر روک چکی تھی " -امی پلیز -میں فیصلہ کر چکی ہوں -میں اس کے ساتھ اب کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی "-وہ ان کے سروں پر بم پھوڑ کر جا چکی تھی اور وہاں موجود افراد کے چہرے قیامت کی لرزہ خیزی سے کم نہ تھے-

اگلے کئی دن ہی سب اسے سمجھاتے رہے تھے لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی - کسی کے پیار , ڈانٹ پھٹکار کسی چیز کا اس پر اثر نہیں ہو رہا تھا -وہ ثابت قدم تھی---

محض ایک دو واقعات نے اس کی زندگی کو اتھل پتھل کر دیا تھا - لیکن وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مضبوط ہوتی جا رہی تھی --وہ جتنا

سوچتی حیران ہوتی اسے خود یقین نہیں تھا وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی --

وہ خود کو مختلف کاموں میں مصروف کر چکی تھی - ساتھ ساتھ اس نے کتاب اللہ کو بھی سمجھنا شروع کر دیا تھا - قرآن کا آغاز اس نے اس وجہ سے کیا تھا تا کہ اپنے اور خاور کے قطع تعلق کا وہ لوگوں کو اسلامک لاجک دے سکے لیکن اس کتاب نے اس کیلیے اس کے علاوہ بھی کئی دنیا ئیں کھول کے رکھ دی تھیں - وہ جتنا پڑھتی جاتی مختلف کیفیات سے گزرتی جاتی - کبھی اللہ کے خوف سے آنکھیں بھر آتیں - کبھی حیران , کبھی پریشان اور کبھی ششدر رہ جاتی -- اور پھر اچانک سے کوئی آیت اسے حوصلہ دے جاتی --

انیسہ بیگم اس کے پاس آئیں جب وہ اپنے کسی پراجیکٹ پر کام کر رہی تھی " - ہانیہ ادھر آ میرے پاس بیٹھو "

"جی امی"

"تم نے اپنا فیصلہ تو کر لیا اور اس پر جم بھی گئی ہو لیکن خاور کا سوچا ہے کبھی"?

"میں اس کے بارے میں کیا سوچوں امی "? وہ اب ضبط نہیں کھونا چاہتی تھی -

"جسطرح سے تم نے اس سے بات کی اور پھر قطع تعلق کر لیا ایسے بھی کوئی کرتا ہے کیا ? اگر فیصلہ کرنا ہی تھا تو اس کو بھی اپنی بات سمجھاتی تا کہ تمہاری طرف سے اس کا دل صاف ہو جاتا " - غصہ ختم ہوا تھا تو وہ اسے سمجھانے لگی تھیں --

"امی میں دوبارہ اس سے بات نہیں کر سکتی پلیز " - اس کا لہجہ ملتجیانہ تھا" -- آپ میری طرف سے اس کو کہہ دیں ردا سے شادی کر لے وہ بہت اچھی لڑکی ہے وہ دونوں خوش رہیں گے ساتھ - لیکن اب ہم دونوں کی ایک دوسرے کی زندگی میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی اور وجوہات میں پہلے بتا چکی ہوں " - بات ختم کر کے وہ دوبارہ کام میں مصروف ہو چکی تھی گویا اسے اب اس ٹاپک سے کوئی فرق ہی نہ پڑتا ہو - وہ بے بسی سے بیٹی کو دیکھ کر چلی گئیں --

وقت انسان کے اندر بہت ٹھہراؤ لے آتا ہے اور یہ ٹھہراؤ خاور کی ذات کا خاصہ بھی بن چکا تھا - وہ پڑھائی کے بعد نوکری میں مصروف ہو چکا تھا لیکن ہانیہ کا آخری ملاقات کا سرد رویہ ابھی بھی چبھتا تھا - لیکن وہ حالات پر سمجھوتہ کر چکا تھا -- اور پھر انیسہ بیگم کا فون پر اسے ساری بات سے آگاہ کرنا , وہ بہت کچھ سمجھ گیا تھا -- ہانیہ جو کر رہی تھی وہ ان دونوں کے حق میں بہتر تھا وہ سمجھ گیا تھا --

اس روز کے بعد سے انیسہ بیگم نے اسے طعنے دینے چھوڑ دیئے تھے - وہ جان گئیں تھیں کہ اب ہانیہ کبھی خاور کے ساتھ تعلقات استوار نہیں کرئے گی - اور دوسری طرف ہانیہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ قرآن کو سیکھنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کیلیے آسان بنانے کی کوششوں میں لگ چکی تھی - زندگی گزارنے کا بڑا مقصد اسے مل چکا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ اس میں کامیابی کی ہی کسی سیڑھی پر کھڑی ہو گی - ساتھ ہی اسے یہ یقین بھی ہو چکا تھا کہ جو اللہ کیلیے شر کا ایک در بند کرتا ہے اللہ اس کیلیے خیر کے دس در کھول دیتا ہے --

ختم شد

حوا کی بیٹی تماشہ نہیں

شبانہ اسلم

حوا کی بیٹی خود کھلونا نہ بنے تو____

آدم کے بیٹے کی مجال ہے جو اس سے کھیلے____

قارئین کرام آج میں آپکے سامنے ایک اور سچی کہانی گوش گزار کر رہی ہوں اس کہانی کو پیش کرنے کا مقصد ان حقائق سے پردہ اٹھانا ہے جس سے ہمارا معاشرہ ان دنوں دوچار ہے اور جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ لوگ بیٹی کی پیدائش پر کیوں آنسو بہاتے ہیں حالانکہ بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں،

جو بیٹوں کی نسبت والدین کا زیادہ خیال رکھتیں اور ان کے دکھ درد کو سمجھتی ہیں مگر پھر آگہی کے در وا مجھ پہ یوں ہوئے کہ وہ کیوں بیٹی کی پیدائش پہ اتنے دکھی اور اداس ہوجاتے ہیں انہیں بیٹیاں بری نہیں لگتی وہ ان کے نصیب سے ڈر جاتے ہیں کیونکہ بیٹی کے نصیب کو تو بادشاہ بھی خزانے دے کر نہ بدل سکا۔۔۔،

بیٹیاں کسیا چھی نہیں لگتی والدین اپنی بیٹیوں کو سب کچھ اپنی بساط سے بڑھ کر دے سکتے ہیں۔

اگر نہیں دے سکتے تو انکو اچھا نصیب نہیں دے سکتے موجودہ زمانے میں ہمارے معاشرے میں جو سسٹم رائج ہو چکا ہے اس کی رو سیا چھی بھلی لڑکیاں اچھے رشتوں کی آس میں گھروں میں بیٹی بوڑھی ہو رہی ہیں۔۔۔،

کیوں کہ لڑکے والوں کی ترجیحات کچھ زیادہ ہی حد سے تجاوز کر چکی ہیں رشتے نیک سیرتی اور اچھے اخلاق کی بنا پر نہیں لالچ اور خود غرضی کی بنیاد پر قائم کیے جا رہے ہیں،

معاشرے کے ان بدصورت رویوں کی تلافی کیونکر ہو ممکن۔۔

۔کہ ہم خود ہیں گونگے بہرے تماشائی ۔۔۔

میں کڑھتی ہوں یہ سب دیکھ کر۔

میرا دل خون کے آنسو ہے پیتا کہ جب میں بے بس و مجبور والدین کو سمجھوتے کا زہر پیتے دیکھتی ہوں کہ کسی طرح انکی بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے،

میں لرز کر رہ جاتی ہوں تب جب مجبور لوگ اپنی بیٹی کا گھر بسانے کی خاطر بے حس اور مطلبی لوگوں کے جائز و ناجائز مطالبے مانتے ہیں۔۔۔،

زمین کے ان ناخداوں کو خبر نہیں شاید کہ ان کی پکڑ کتنی سخت ہوگی جب قادر مطلق ان جیسے لوگوں پہ اپنی گرفت کریگا۔۔۔،

میری دعا ہے کہ اللہ پاک اگر کسی کو بیٹی دے تو اسکا نصیب بہت بہت اچھا کرے آمین کیونکہ بیٹی چاہے غریب کی ہو چاہے امیر کی بیٹی تو بیٹی ہوتی ہے۔۔۔،

اور میں سلام پیش کرتی ہوں اس جرآت مند بیٹی کو جس نے لالچی لوگوں کے لالچ کے آگے سر خم تسلیم کرنے کی بجائے ان خود غرض لوگوں کو ایسا آئینہ دیکھایا کہ انکی آنے والی نسلیں تک اس میں اپنے آباواجداد کے مکروہ چہروں کا عکس دیکھیں گے۔۔۔،

مجھے تو اس لڑکی کا فیصلہ پسند آیا کیا آپکو پسند آیا؟

کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس لڑکی کا فیصلہ صیح تھا یا پھر غلط یہ آپ لوگ بتائیں گا۔۔۔؟

کیونکہ ظلم کرنے والا اور ظلم سہنے والا دونوں ظالم کہلاتے ہیں۔۔۔۔،

یہ کہانی ملک پورگاں کی شمسہ کی کہانی ہے یہ کہانی صرف شمسہ ہی کی نہیں بلکہ ہر اس لڑکی کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے جسے ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ اپنے والدین کی بیبسی اور مجبوریاں دیکھتے ہوئے جبر کا طوق اپنے گلے میں پہن لیتی ہیں مگر شمسہ نے ایسا نہیں کیا وہ باطل کے سامنے جھکنے والوں میں سے نہیں بنی بلکہ حق کی خاطر ڈٹ گئی۔۔۔،

لو آپو تم یہاں بیٹھی ہو؟

میں تمہیں کہاں کہاں نہ دیکھ آئی۔۔۔

کنول نے ایک ہاتھ کمر پہ ٹکا کر اور دوسرا ہاتھ نچا کر شمسہ کو بے یقینی سے تکا۔۔۔

کیوں سب خیریت ہے؟

شمسہ نے حیرانی سے دیکھا۔۔۔

جی آپو سب خیریت ہے اور اماں آپکی خیریت مطلوب چاہتی ہیں کنول غیر سنجیدگی سے بولی۔۔۔

اوہو کیا کہنا چاہ رہی ہو صاف لفظوں میں کہو؟

وہ چڑ ہی گئی۔۔۔

لو جی آپو صاف لفظوں میں یہ کہ ادھر گھر میں آپ کی شادی کے چرچے ہو رہے ہیں اور ادھر آپ مزے سے پینگ پہ بیٹھی جھولے جھول رہی ہو کنول نے بات کے آخر میں دانت نکالے۔۔۔۔

تو کیا کروں اس صدمے سے جھولے لینا چھوڑ دوں؟

وہ تیز تیز پینگ جھولتی ہوئی لاپرواہی سے بولی۔۔۔

نہیں میں نے ایسا تو نہیں کہا آپو رانی۔۔

میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ چل کر اماں کی خدمت میں حاضری لگا لو بہت دیر سے یاد فرما رہی ہیں وہ شرارتی لہجے میں بولی۔۔۔،

اف ایک تو جب بھی میں پینگ پر بیٹھتی ہوں اماں کو زمانے بھر کے کام یاد آجاتے ہیں کبھی آٹا گوندھنا ہوتا تو شمسہ یاد آجاتی تو کبھی کپڑے دھونے ہوں تو شمسہ کی ڈھونڈھیا مچ جاتی ہے،

کبھی سلائی کبھی کڑھائی ہر کام میں اماں کو میری ہی کمی محسوس ہوتی ہے اماں کو میری یاد تو ستاتی ہے پرانہی کاموں کے لیے وہ فرفر بول کر

آخر میں منہ پھلا کر کنول کو دیکھنے لگی۔۔۔،

اور بی اے تو میں نے جھک مارنے کے لئے کیا تھا اس ڈگری کا فائدہ تو کوئی حاصل ہونا نہیں اچارہی ڈالونگی شاید اسکا وہ پینگ کی رفتار آہستہ کرتی ہوئی پاوں سیروک کر اچھل کر اتری۔۔۔"

توبہ ہے آپو شروع ہی ہو جاتی ہو تم تو۔

اماں نے کام کے لیے نہیں بلایا کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ مجھے تو اماں نے یہی کہا تھا کنول نے دونوں گالوں پہ ہاتھ مار کر اسکی برق رفتاری سے چلتی زبان ملاحظہ کی اور نروٹھے پن سے بولی۔۔۔

اچھا نا چلو وہ کمر کے گرد بندھے ڈوپٹے کی گرہ کھول کر سلیقے سے اوڑھ کر بولی۔۔۔"

جی اماں آ گئی میں بولو اب وہ ایسی کیا ضروری بات تھی جو اپنا قاصد ہنگامی حالت میں میرے پیچھے روانہ کر دیا تھا،

اس نے اپنے دھیان بیٹھی ماں کو پیچھے سے جالیا اور کمر پہ لاڈ سے بازو باندھے۔۔"

آے ہائے شمسہ ہٹ پیچھے اتنی مشکل سے سوئی میں دھاگہ ڈالا تھا نکل گیا پھر شمسہ کی ماں اسکی حرکت پہ جھنجھلا گئی۔۔۔

اماں عینک لگا کر بھی آپ سے سوئی میں دھاگہ نہیں ڈلتا لا دو مجھے میں اور کنول کس مرض کی دوا ہیں وہ ماں کی عینک اتار کر ایک طرف رکھنے کے بعد اس کے ہاتھ سے سوئی دھاگہ لیکر شرارت سے بولی۔۔۔"

مخول کرتی ہے ماں کے ساتھ پڑھ لکھ کے بڑی باتیں بنانا آ گئی ہیں ماں کو طعنے مارے گی وہ خفگی سے دیکھ کر بولی،

اماں ناراض نہ ہوا کرو آپ تو میری بیوٹی کوئین ہو وہ ماں کو آنکھ مارتے ہوئے بولی۔۔"

دیدوں کا پانی مر گیا ہے کیا؟

شرم نہیں آتی ایسے لوفرانہ انداز میں ماں کو آنکھ مارتے ہوئے شمسہ کی اس حرکت پر اس کی ماں چراغ پا ہو کر بولی۔۔۔،

او میری پیاری اماں ماں کو ہی آنکھ ماری ہے نا؟

گلہ تو تب بنتا جب کسی غیر کو دیکھ کر آنکھ مارتی وہ غیر سنجیدگی سے ہنسی دبا کر بولی۔۔۔"

اور یہ لو ڈل گیا دھاگہ پکڑو اب اسے۔

اس نے جھٹ پٹ سوئی میں دھاگہ پرو کر ماں کو تھمایا

اسے چھوڑ اور ادھر آ میری بات سن شمسہ کی ماں نے اسکی بے فضول بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سوئی سلائی مشین میں رکھی اور اسکا ہاتھ تھام کر پاس بٹھا لیا

مذاق چھوڑ اور سنجیدگی سے میری بات سن وہ جو پچھلے ہفتے جھنڈا والا گاں سے لڑکے والے آئے تھے نا تجھے دیکھنے۔۔۔"

شمسہ کی ماں نے تہمید باندھی

جی اماں وہ مودب ہوئی

تیرے ابا بتا رہے تھے تو انہیں بہت پسند آئی ہے کل وہ با قاعدہ رسم کرنے آ رہے ہیں شمسہ کی ماں نے مسکراتے ہوئے دیکھا۔۔"

لڑکا اچھا ہے لوگ بھی بھلے مانس ہی لگے ہیں اور سب سے بڑھ کر انہوں نے جہیز کے نام پر کچھ بھی نہیں مانگا مجھے اور تیرے ابا کو تو کوئی اعتراض نہیں،

تو بتا تجھے کوئی اعتراض ہے اسکی ماں نے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔ "

اماں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اسے ڈھیروں شرم آئی

تو پھر کل ہم بلا لیں نا؟

اسکی ماں نے تصدیق چاہی۔۔

جی اماں جیسا آپکو مناسب لگے جو آپ دونوں کا فیصلہ ہوگا میری سر آنکھوں پر اماں وہ سر جھکا کر شرمیلی مسکراہٹ سے بولی۔۔"

اب آپ نے مجھے گھر سے نکالنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں سوائے بے زبان گائے کی طرح سر ہلانے کے۔

وہ ایک دم اپنی پرانی جون میں آتے ہوئے بولی

جیتی رہ میری فرمانبردار بچی اللہ تیرے نصیب اچھے کرے

ہیں ہیں یہ تو کیا بولی اسکی سعادت مندی پہ نثار ہوتی ماں کو ایک دم سے اسکے آخری الفاظ چونکا گئے۔۔"

وہ ہنس رہی تھی۔۔

دھی رانی چنگی) اچھی (تو تو بہت ہے بس کبھی کبھی میں تیری اس گز بھر لمبی چلتی زبان سے خائف ہو جاتی ہوں اسکو قابو میں کر اب تجھے اگلے گھر جانا ہے اور سسرال کا معاملہ تجھے پتہ نازک ہوتا ہے سمجھ رہی ہے نا میری بات وہ سنجیدگی سے سمجھا رہی تھی اسے۔۔۔

اماں آپ کیوں فکر کر رہی ہو؟

میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ کہاں بولنا ہے اور کہاں چپ رہنا ہے وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔۔۔

ارے فکر کیسے نہ کروں یہی تو مسلئہ ہے تو تو وہاں بھی بول پڑتی ہے جہاں نہیں بولنا ہوتا شمسہ کی ماں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔۔

یاد ہے نا؟

رخشندہ کے پوتے کی سالگرہ پہ تو نے کیا کیا تھا اماں نے اسے یاد دہانی کرائی، ہاں تو اماں کچھ غلط نہیں کہا تھا وہ رخشندہ چچی اپنی بہو طوبی کو بے نقط سنا رہی تھی وہ بھی ناجائز۔سارے کام کا بوجھ بھی اس بیچاری کے سر پر لدا ہوا تھا اور ذلیل بھی اسے ہی کیا جا رہا تھا اور اپنی تینوں بیٹیاں مہارانیاں بنی پیر پسارے مزے سے بیٹھی تھیں،

گلاس توڑا پوتے نے شامت بہو کی آ گئی وہ تو مصروف تھی اسکا کیا قصور کہ بھری محفل میں سب نے اسے بولنا شروع کر دیا۔۔۔

رخشندہ چچی کو اگر میں نہ چار سناتی تو آج طوبی سکون میں نہ ہوتی کیسے سب نادم ہوئے تھے وہ جوش بھرے لہجے میں بولتی چلی گئی۔۔۔"

اور اب سنا ہے اس دن کے بعد سے طوبی پہ تقدیر کے ساتھ ساتھ سسرال والے بھی مہربان ہو گئے وہ دبی دبی سی ہنسی ہنس کر بولی۔۔۔

تو نے تقریر ہی ایسی کی تھی کہ سب نے دانتوں تلے انگلیاں دے لی تھی اور رخشندہ کے تو ہوش ٹھکانے آ گئے تب سے اماں بیساختہ ہنسی،
ہاں نا اماں حق بات کہنے میں کیسی جھجک مجھے اس وقت جو ٹھیک لگا میں نے کیا اس وقت ایک طرف طوبی اور دوسری طرف اسکا سارا سسرال تھا کوئی بھی تو اس مظلوم کے ساتھ نہیں کھڑا تھا،
بیچاری سر جھکائے سب کی سن رہی تھی بہت دکھ ہوا تھا مجھے۔۔۔خیر اب تو اس دن کے بعد سے طوبی کی زندگی آسان ہو گئی آپ نے خود دیکھا ہے نا اس نے تائید چاہی
اوفوہ تو نے مجھے کن باتوں میں لگا دیا چھوڑ فضول باتیں کام کی بات کر کل مہمانوں کے لیے کیا بنانا ہے بتا اماں نے بات پلٹی۔۔۔
ہاں اماں سوچ لو ملکر بنالیں گے وہ بھی اثبات میں سر ہلا کر بولی۔۔۔
اگلے دن لڑکے والے منگنی کی رسم کرنے پہنچ گئے شمسہ نے ہلکے گلابی اور فیروزی امتزاج کا دیدہ زیب سوٹ پہن رکھا تھا۔۔"
ہلکے سے میک اپ نے اسکے روپ کو چار چاند لگا دیے تھے
کنول نے اسے لاکر مہمانوں میں بیٹھا دیا۔۔"
شمسہ شرمائی لجائی ان کے درمیان آ کر بیٹھ گئی بظاہر تو لوگ اچھے ہی لگ رہے تھے پھر لڑکے کی ماں نے شمسہ کو خوبصورت سی انگوٹھی پہنائی سب کا منہ میٹھا کرایا گیا اور ہنستے مسکراتے منگنی کی رسم اختتام پذیر ہوئی۔۔۔"آپو خوش ہونا؟
کنول نے اسکے دمکتے ہوئے روپ کو دیکھا
ہاں میری بہن خوش ہوں میں وہ آئینے میں اپنے سجے سنورے روپ کو دیکھ رہی تھی مسکرا کر بولی
آپو ویسے بڑی ہی سوہنی لگ رہی تھی تو آج۔کسی کی نظر نہ لگے کنول نے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔۔۔
اچھا۔۔۔میری کنول بھی تو کچھ کم نہیں لگ رہی تھی ویسے وہ چوڑیاں اتارتے ہوئے مسکرا کر بولی
ہیں سچی۔کنول نے بے یقینی سے دیکھا
آہو مچی وہ اسی کے انداز میں بولی
اور دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑی۔۔۔"
کنول اری او کنول اماں کی آواز آئی
جاو کنول اماں بلا رہی ہیں اس نے میک اپ صاف کرتے ہوئے کہا۔۔۔
اچھا آپو جاتی ہوں نا وہ تھکی تھکی سی اٹھی مگر دو منٹ بعد ہی واپس بھی آ گئی آپو جی اماں نے آپکو یاد کیا ہے وہ آ کے دھپ سے چار پائی پر بیٹھی اور ٹانگیں جھلانے لگی۔۔۔مجھے؟؟
ابھی تو باہر سے آئی ہوں ایک ہی پوز میں بیٹھ بیٹھ کر کمر اکڑ گئی تھی اس نے حیرت سے دیکھا اب کیا کام یاد آ گیا اماں کو آج تو رعایت دے دیتی وہ ہنسی۔۔۔"

پتہ نہیں پوچھ لو جا کے میں تو سونے لگی کنول نے شانے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔۔

اچھا میں دیکھتی ہوں اس نے سائیڈ پر پڑا دوپٹہ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔۔۔"

میں صدقے جاواں اپنی سوہنی دھی دے آج میری دھی اتنی سوہنی لگ رہی کہ میں نے نظر وار کے چولہے میں ساڑی۔ شمسہ کی ماں نے اسکا ماتھا چوما،

شمسہ جب سے تجھے دیکھا ہے وہ لوگ تو مانو باولے سے ہو رہے ہیں جلد از جلد شادی کرنا چاہتے کہتے بس اب ہمیں رخصتی کا وقت دے دو وہ بھی

ایک ماہ کے اندر اندر ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ان لوگوں کا فون آیا تھا تیرے ابا نے تو ہاں بھی کر دی میں نے کہا تجھے بھی بتا دوں۔۔۔"

اماں اتنی جلدی وہ اس اچانک افتاد پہ گھبرا گئی

او کوئی جلدی نہیں اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے ہمارے پاس تیرا جہیز بھی تیار ہے تو پھر کاہے کی دیری؟

ایک مہینے کے اندر ہی باقی تیاری ہو جائے گی۔۔۔،

اور جو تو نے کچھ خریدنا ہے تو فہرست بنا دے لے دونگی شمسہ کی ماں تو ہتھیلی پہ سرسوں جمائے بیٹھی تھی

اماں میں کیا کہہ سکتی ہوں جب سب کچھ آپ لوگوں نے پہلے ہی سے سوچ رکھا ہے وہ دھیمے لہجے میں بولی

اچھے قدر کرنے والے لوگ ہیں اتنے ارمانوں سے بیاہ لے جا رہے ہیں دیر کیا جلدی کیا شادی تو کرنی ہی کرنی ہے نا۔

تو نہ کر فکر کسی بھی قسم کی ہم ہیں نا اسکی ماں نے تسلی دی۔۔۔۔"

جی اماں ٹھیک ہے شمسہ نے اثبات میں سر ہلایا وہ اس بات پہ حیران بھی تھی اور پریشان بھی مگر ماں پہ ظاہر نہ ہونے دیا۔۔

اکلی کلیکلی پگ میرے ویر دی ڈوپٹہ میرے پائی دا فٹے منہ جوای دا

کنول اور اسکی سہیلی کھلکھلا کر ککلی ڈال رہی تھیں

شمسہ مایوں کے پیلے جوڑے میں سر جھکائے بیٹھی انہماک سے مہندی لگوا رہی تھی اور گاہے بگاہے انہیں بھی دیکھ رہی تھی۔۔۔

شمسہ کے ابا کتنی رونق لگی ہے نا؟

شمسہ کی ماں دمکتے چہرے کے ساتھ بولی۔۔۔

آج شمسہ کی مہندی کی رات تھی

ہاں شمسہ کی ماں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا ابھی کل کی بات تھی شمسہ اس آنگن میں کھیلتی کودتی تتلیاں پکڑتی اور میرے پیچھے

پھرا کرتی تھیں،

اور آج اس گھر میں اسکی آخری رات کل یہ رخصت ہو کے پیا گھر چلی جائے گی جس کی چہکار سے یہ آنگن گونجا کرتا تھا کل یہ آنگن

سونا کر جائے گی وہ اداس لہجے میں بولا۔۔۔۔"

ایسے نہ بولو شمسہ کے ابا آج تو ہماری دھی رانی کے ہاتھوں میں شگنوں کی مہندی لگی ہے اور یہ وقت تو نصیب والوں پہ آتا ہے۔۔۔

بیٹیاں تو ہوتی ہی پرایا دھن ہیں ایک نہ ایک دن تو انہیں جانا ہی ہوتا ہے بس دعا کرو شمسہ اپنے گھر خوش رہے اداس تو وہ بھی ہو رہی تھی مگر

خودکو سنبھال کر خاوند کی دلجوئی کر رہی تھی۔۔۔"

میرا تو لوں لوں اپنی دھی رانی کیلیے دعا گو ہے نیک بختے وہ نمناک آنکھوں سے شمسہ کی طرف دیکھنے لگا۔۔

شمسہ کی سہیلی اسکے کان میں ہولے سے کچھ کہہ رہی تھی اور وہ شرمیلی مسکان سے جواب دے رہی تھی۔۔۔

ساڈا چڑیاں دا چنباں وے بابل اساں اڈھ جانا ساڈی لمبی اڈاری وے اساں مڑ نہیں آونا۔

اچانک ڈھولکی کی تھاپ کے ساتھ یہ گانا چھیڑ دیا گیا شمسہ نے چونک کر دیکھا اور اپنے ماں باپ کو دور کھڑے اپنی جانب نچھاور ہوتی نگاہ سے تکتا دیکھ کر اسکی آنکھیں آنسوں سے لبریز ہو گئیں۔۔۔

اسکے ماں باپ لپک کر اسکے پاس آئے اور باپ نے کانپتا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیا ماں نے بھی سینے سے لگایا کنول بھی سب چھوڑ چھاڑ آ کر ساتھ لگ گئی اور سب آنکھیں نمناک ہو گئیں یہ منظر دیکھ کر۔۔۔"

اگلے دن شمسہ پہ ٹوٹ کر روپ آیا لال لہنگے میں نفاست سے کیے میک اپ میں وہ پہچانی ہی نہ جا رہی تھی اسکی ماں کی جب جب نگاہ پڑتی تب تب بلائیں لینے لگتی تھی اور پڑھ پڑھ کر پھونکتی تھی۔۔۔

آج اسکے گھر والوں کے لیے کڑا وقت تھا کیونکہ آج انکی لختِ جگر کی رخصتی کا دن تھا،

بارات آ گئی بارات آ گئی کنول اپنی سکھیوں کے ساتھ شور مچاتی ہوئی آئی۔۔۔

ماشااللہ بھائی جی بھی بڑے سوہنے لگ رہے ہیں کنول نے پاس آ کر نظریں جھکائے بیٹھی شمسہ کیکان میں کہا

چپ جھلی نہ ہو تو اس نے گبھرا کر نظریں دوڑائیں اور اطمینان کا سانس لیا کمرے میں دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔۔"

سچی بڑی سوہنی جوڑی لگے گی کنول نے آنکھ ماری

پھر نکاح کا مرحلہ تو باخوبی طے ہو گیا مگر اچانک سے باہر سے ملی جلی آوازوں کا شور اٹھا کنول کیا ہوا ہے باہر اس نے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا جو انجانے خدشے کو محسوس کرتا ہوا تیزی سے ڈھرکنے لگا تھا۔۔۔"

پتہ نہیں آپو میں دیکھتی ہوں جا کر وہ بھی پریشانی سے سن گن لینے باہر نکلی۔۔۔

اللہ خیر اسکے منہ سے بمشکل ادا ہوا،

دیکھو بھائی جی ہم نے آپ سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ کیا؟ نہیں نا۔ بس اک نکی سی خواہش کا اظہار ہی کیا ہے نا تو اس میں کیا برائی ہے اور آپ خود سوچو آپ کی بیٹی کے کام آئے گی نا دولہے امداد کا باپ مونچھوں کو تاو دیتا ہوا مکاری سے بولا۔۔۔

آپ لوگوں نے پہلے تو ایسی کوئی بات نہ کی تھی یہی کہتے رہے کہ ہمیں بہو کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے اب عین رخصتی کے وقت ایسا مطالبہ ٹھیک ہے کوئی مسلہ نہیں آپ ابھی رخصتی تو کرا ئیں گڈی میں بعد میں لے کر پہنچا دونگا شمسہ کے باپ نے دل ہی دل میں پیچ وتاپ کھاتے ہوئے کہا۔۔۔

نہیں بھائی جی۔۔۔ یہ تو ممکن نہیں گڈی چاہیے تو ابھی نہیں تو ہم لڑکی کو رخصت کرا کے نہیں لے جائیں گے شمسہ کے سسر نے آنکھیں

ماتھے پر رکھ لی وہ کسی بھی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہ تھا شاید۔۔۔

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ویر جی؟

میری بیٹی کا قصور کیا ہے جو آپ لوگ اس معصوم کے ساتھ ایسا کر رہے ہو،

شمسہ کی ماں نے تڑپ کر آگے بڑھی اور بولی

بہن جی کیا کریں ہم بھی مجبور ہیں لڑکا نہیں مانتا ہم نے تو جہیز کے نام پہ اک شے نہیں مانگی بس آپکے جوائی کی یہ چھوٹی سی فرمائش ہے آخر یہ اب آپکا ہی تو بیٹا ہے نا۔دولہے کی بھاری بھرکم جسامت کی ماں مسکین سی شکل بنا کر بولی جیسے کوئی معمولی بات ہوگئی ہو۔۔۔

پتر تو ہی کجھ بول شمسہ کی ماں نے آس بھری نگاہ داماد پر ڈالی پر وہ نگاہیں چرا کر منہ پھیر کر بیٹھ گیا شمسہ کی ماں اپنا سا منہ لیکر رہ گئی۔۔"

شادی میں آئے مہمان اس اچانک صورتحال کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے تھے کچھ نے تو لڑکی والوں کی حمایت میں بولنا شروع کر دیا تو کچھ حاسد مخالفت میں بھی پیش پیش تھے کچھ نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی

غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔

میری عزت کا سوال ہے جی کچھ خدا کا خوف کرو میں آپکے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں شمسہ کا باپ منت سماجت پہ اتر آیا

ہاں بھائی صاحب گڈی لیکر بھیج دیں گے آپ خیری صلا رخصتی تو کروائیں۔۔۔

شمسہ کی ماں نے بھی عاجزی سے کہا

نہ جی اب تو بات پورے پنڈ ال میں پھیل گئی ہے میرا شریکہ برادری ہے سب دیکھ اور سن رہے ہیں مجھے اپنا مذاق نہیں اڑوانا آخر کو میری بھی عزت کا معاملہ ہے شمسہ کا سسر کمر پہ ہاتھ باندھ کر سرد لہجے میں ہٹ دھرمی سے بولا۔۔۔ "

شمسہ کی ماں مہمانوں کی سیوا کرو کوئی کمی نہ رہے خاطر داری میں میں آتا ہوں،

شمسہ کے باپ نے لرزتی آواز سے کہا۔۔۔

اچھا پتر میں ھنی) ابھی (لے کے آیا اس کے باپ نے فٹ سے اٹھ کر سیف سے پیسے نکالے اور باہر نکل گیا

بھائی جی کہاں گئے آئے نہیں ابھی تک دولہے کی ماں اپنے تھل تھل کرتے وجود کیساتھ تیزی سے شمسہ کی ماں کی طرف آئی۔۔۔،

جی آتے ہی ہونگے گڈی لینے گئے ہیں ایتھے کول ہی قیمتی گڈیاں دی ورکشاپ اے۔

شمسہ کی ماں نمناک آنکھوں سے اس بجس عورت کی طرف دیکھ کر بولی جو مزے سے بوتل کے سپ بھر رہی تھی اور جو ابھی ابھی شمسہ کی ماں نے مزید منگوا کر سرو کرائی تھی۔۔۔"

اے لو پتر پھڑ وگڈی دی چابی تے ہن رخصتی کرالو شمسہ کے باپ نے بغیر کسی تاثر کے چابی دولہے کو تھمائی

گاڑی کی چابی دیکھ کر دولہے کے گھر والوں کے بگڑے تیور ہی بدل گئے اور ساتھ ہی ان سب کی باچھیں چر کر کانوں سے جا لگیں۔۔۔

شادی والے گھر میں جو سوگواری سی چھا گئی تھی وہ اب خوشی کی لہر میں تبدیل ہو گی تھی،

ہاں ہاں کیوں نہیں کھتے اے میری دھی رانی شمسہ لیاواوس نوں فناٹ ۔

شمسہ کی چربی زدہ بھدی ساس شہد آ گیں لہجے میں مکاری سمو کر بولی،

دولہا بھی زیرلب مسکرارہاتھااور دولہے کے باپ کی تنی ہوئی گردمیں اور اکڑ پیدا ہوگئی تھی اپنی فتح پہ۔

شمسہ کو دولہے کے پہلو میں لاکر بیٹھایا گیا دودھ پلائی کی رسم ہوئی اور پھر شمسہ کو آنسوں اور سسکیوں کے درمیان دعاں کے حصار میں کلام پاک کے سایے تلے گاڑی میں بیٹھا کر رخصت کر دیا گیا۔۔"

بارات ملک پور سے روانہ ہوکر جھنڈاوالا گاں کی طرف چل پڑی دولہے کی ماں وقتاً فوقتاً دلہن سے لاڈ پیار کا عظیم الشان مظاہرہ کر رہی تھی شمسہ بیتاثر نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔۔۔

جب بارات لڑکے کے گھر کے باہر پہنچی تو لوگوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہونے لگا سب لوگ وفورِ اشتیاق سے نئی نویلی دولہن اور نیو برانڈ کار کو دیکھ رہے تھے۔۔۔

شمسہ کی ساس باہر نکلی اسکے سسر نے مغرور سی نگاہ اطراف میں ڈالی اور گاڑی کا دروازہ بند کیا لوگ انکی قسمت پہ رشک کر رہے تھے اور وہ خود خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے کہ۔۔۔

اچانک سے سارا منظر ہی بدل گیا۔۔۔

دھی رانی آ بسم اللہ گاڈی وچوں پیر بارلا شمسہ کی ساس نے ہاتھ بڑھایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی،

اے دلہن کیا ہوا اتر بھی جا اس کی ساس بگڑ کر بولی

مگر وہ کچھ نہ بولی نہ ہی جسم کو کوئی جنبش دی

اماں ہٹو میں اتارتا ہوں امداد نے اپنی طرف سے ہیرو بنتے ہوئے کہا اور شمسہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر پیار سے پکارا

مگر اس نے سننا تو دور کی بات اپنے مجازی خدا کی طرف دیکھنا تک گوارا نہ کیا وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔۔۔

کیا بات ہوگئی بٹیا رانی گاڑی سے کیوں نہیں اتر رہی دولہے کا تایا گلا کھنکار کر بولا اور دو قدم آگے بڑھا

دھی رانی اتر بھی جاو سب تمہارے سواگت کے لیے کھڑے ہیں دولہے کے تایا نے شفقت سے شمسہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔،

انکل جی کیسے اتر جاں میرے پاں میں تو جوتے ہی نہیں ہیں شمسہ نے لہنگا سرکا کر اپنے جوتوں سے بےنیاز مہندی سے سجے پاں سامنے کیے۔۔۔ ہیں؟؟؟

شمسہ کی ساس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔۔۔

چلو کوئی گل نہیں جاو پتر کوئی اندر سے جا کے جوتی لا کے دو پھر وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولی۔۔۔

نہ جی کوئی اور جوتا کیوں؟

میں تو سونے کی جوتی پہن کر ہی اب گاڑی سے اترونگی مجھے سونے کا جوتا لا کر دو شمسہ نے ایک دم سر اٹھا کر ماں بیٹے کو کھا جانے والی

نظروں سے دیکھا،

وہ شاید اس حملے کے لیے تیار نہ تھے بیذ بان گائے بنی دولہن کے منہ سے غیر متوقع فرمائش سن کر گڑ بڑا کر رہ گئے آس پاس سے دبے دبے قہقہوں کی آوازیں ابھریں۔

کیوں ہمارا تماشہ بنا رہی ہے چل اتر اندر چل کر بات کرتے ہیں اسکی ساس بگڑے تیوروں سے بولی۔۔۔"

ننگے پاں تو نہیں اترونگی اور نہ ہی کوئی عام جوتا پہنوں گی تماشہ نہیں بنوانا تو ابھی اور اسی وقت سونے کا جوتا لا کر دو وہ ہٹ دھرمی سے بولی اور ٹھس بیٹھی رہی

پتر چل نا اندر۔۔ابھی جوتا کہاں سے ملے گا بعد میں بنوا دیں گے اسکا سسر موقعے کی نزاکت دیکھ کر حالات سنبھالنے آگے بڑھا۔۔

نہ جی سسر جی جوتا چاہیے تو ابھی اور اسی وقت اور وہ بھی سونے کا وہ ڈھٹائی سے بولی،

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شمسہ کو گاڑی سے باہر نکال پھینکیں جس نے پورے گاوں میں انکا مذاق بنوا دیا تھا،

لوگ تمسخر سے دیکھ کر ہنس رہے تھے اور انکو خوب سبکی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔

اور پھر شمسہ کو منانے کے لیے انہوں نے ہر پینترا آزما ڈالا مگر سنی ان سنی کر کے آرام سے بیٹھی رہی بات پھیلتی پھیلتی گاں کے چوہدری تک پہنچ گئی وہ بھی وہیں چلا آیا۔۔"

پرا پراہٹو چوہدری صاحب آ گئے رستہ دو چوہدری کے کامی نے آواز دی لوگوں نے پیچھے ہٹ کر راستہ دیا اور آگے آیا

کیا ہوا دھی رانی مجھے بتا چوہدری رب نواز نے نرم لہجے میں کہہ کر شمسہ کے سر پر ہاتھ رکھا،

شمسہ نے اپنے لہنگے کے نیچے چھپائی ہوئی سینڈل نکال کر پہنی اور گاڑی سے باھر آ کر کھڑی ہوگئی،

چوہدری صاحب آپ پنڈ کے وڈے ہونا؟

تو میں آپ کے سامنے ساری بات رکھتی ہوں باقی پنڈ والے بھی سن لیں وہ بے خوفی سے اپنے حلیے کی پرواہ کیے بغیر سب پر نگاہ دوڑا کر آخر میں چوہدری صاحب کی طرف متوجہ ہوئی۔۔۔

یہ جو آپکے پنڈ کے عزت دار لوگ ہیں نا۔جو مجھے بڑے چا اور ارمانوں سے بیاہ کر لائے ہیں یہ اصل میں مجھے نہیں اس عالیشان گاڑی کو بیاہ کر لائے ہیں شمسہ نے اپنے ساس سسر اور شوہر کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے اشارہ کیا

یہ لڑکی خام خواہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہے چوہدری صاحب ایسا کچھ نہیں دولہا منمنایا۔۔۔

اک منٹ چپ مینوں بچی دی گل سنن دو چوہدری رب نواز نے گھر کا،

ہاں پتر بول تو وہ اب شمسہ کی جانب متوجہ ہوا۔۔۔چوہدری صاحب انہیں اپنی بے عزتی کا تو بہت احساس ہے اور جو میرے گھر والوں کے ساتھ کیا گیا وہ ٹھیک تھا،

خام خواہ تماشہ کر رہی ہے اسکی ساس پھولا ہوا منہ مزید پھلا کر بولی۔۔۔

جو میرے گھر پر کیا گیا وہ تماشہ نہیں تھا اس نے ساس پہ آنکھیں نکالی،

ارے تم جیسے لالچی اور خود غرض لوگ صرف اپنے مفاد کو عزیز رکھتے ہیں کسی کی عزت وخودداری کی تم لوگوں کو کیا پرواہ کس طرح عین رخصتی کے وقت میرے والدین کو امتحان میں ڈالا گیا اگر انکی اتنی حثیت نہ ہوتی تو آج میری رخصتی بھی متوقع نہ ہوتی چوہدری صاحب وہ دلگرفتہ سی بولی۔۔۔"

ان جیسے لوگوں نے بیٹی والوں کا جینا محال کر رکھا ہیلالچ اور حرص کی پٹی ان لوگوں نے اپنی آنکھوں پہ باندھ رکھی ہے تبھی تو انہیں کسی کی تکلیف دکھائی نہیں دیتی نہ ہی بیٹی کے باپ کی بیبسی نہ ہی اسکی ماں کے آنسو وہ تنفر سے دیکھتے ہوئے بولی،

میرے باپ کی عزت کا اونچا شملہ انہوں نے اپنے پیروں تلے روندھنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے انکی کوشش ناکام بنادی چوہدری صاحب وہ کرب سے بولی۔۔۔

بیٹیوں والوں نے بیٹیاں پیدا کر کے کوئی گناہ نہیں کیا ہوتا کہ جس کی پاداش میں آدم کے بیٹے ان کے لیے خود ساختہ سزائیں تجویز کرتے پھریں حوا کی بیٹی تماشہ نہیں اسے اپنا حق لینا آتا ہے عورت کو عورت ذات ہونے کی سزا دینا بند کردو خدارا۔۔۔

جیتے جاگتے وجود کو زندہ درگور کرنے کے درپے سماج کے ٹھیکیداروں عورت کو کمزور سمجھنا تمہاری سب سے بڑی غلطی ہے سب دم بخود کھڑے تھے صرف اسی کی آواز گونج رہی تھی،

چوہدری صاحب ان لوگوں کی عزت عزت ہوئی اور میرے بے قصور والدین کی کوئی عزت نہیں کسی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ کچھ لوگ عزت کے اتنے بھوکے ہوتے ہیں کہ وہ دوسرے کی عزت بھی کھا جاتے ہیں،

چوہدری صاحب ہم نے تو کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا اک گڈی کی فرمائش ہی کی تھی جی کوئی ناجائز مطالبہ نہیں کیا تھا اس کی ساس ڈھٹائی سے بولی۔۔۔

جی اگر انکا مطالبہ جائز ہے تو میرا مطالبہ بھی جائز ہے وہ جتاتی نظروں سے دولہے کی طرف دیکھ کر بولی۔۔۔

اے ذیادہ چبڑ چبڑ نہ کر نہیں تو یہی کھڑے کھڑے طلاق دیدونگا دولہا اپنے مصنوعی لبادے سے باہر آکر بولا

ہاں ہاں میرے بیٹے کو کوئی کمی تھوڑی ہے اسکی ساس اپنا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے طنزیہ بولی۔۔۔

ارے لالچی انسان تو مجھے کیا طلاق دے گا میں تو خود تیرے ساتھ ایک پل رہنے کی روادار نہیں ہوں وہ حقارت سے بولی،

چوہدری صاحب انکی اصلیت آپ کے سامنے خود ہی آ گئی ہیاب آپ خود بتائیں کہ میں نے غلط کیا یا درست وہ مسکرا کر اعتماد سے بولی۔۔۔

ہاں دھی رانی تو بالکل ٹھیک ہے ان بغیرتوں کو کوئی دید لحاظ نہیں ہے کسی کی بیٹی کی زندگی کو مذاق سمجھا ہوا ہے غضب خدا کا شادی کے نام پر ایسے اوچھے ہتکھنڈے استعمال کرتے ہیں کہ دل کانپ جاتا ہے رب دا قہر نازل ہوان پہ چوہدری صاحب بھی طیش میں آ گئے،

چل دھی رانی تو میرے ساتھ چل اک منٹ وی ہور نہیں رکنا ایتھے انہوں نے حتمی انداز میں کہا۔۔۔

چوہدری صاحب اے تسی چنگا نہیں کر رہے دولہے کے باپ نے دبا دبا سا احتجاج کیا،

تے تسی چنگا کیتا اس معصوم بچی دے گھر والیاں نال؟

آج اک مطالبہ کیتا کل نوں لائناں لگ جان گیئاں چوہدری رب نواز نے غضبناک نظروں سے دیکھا۔۔۔

سب کو سانپ سونگھ گیا،

چل دھی بیٹھ گڈی وچ بختو چل گڈی چلا باحفاظت چھڈ کے آیے بچی نوں چوہدری نے اپنے ڈرائیور کو آواز دی

دم بخود مجمع میں حرکت پیدا ہوئی اور سارا گاں جیسے تالیوں سے گونج اٹھا۔۔۔

سب لوگ شمسہ کی جرات پہ سلامی دینے لگے،

شمسہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئی اور سب لوگ اب لڑکے والوں پہ لعنتیں ڈال رہے تھے وہ شرمسار سے اندر چلے گئے

یہ لوگ اسی قابل ہیں ایسا ہی ہونا چاہئے تھا انکے ساتھ سب شمسہ کی دلیری پہ مسرور تھے۔۔۔ شمسہ؟

کی ہویا تو اچانک ادھر کسطرح اسکے ماں باپ اچانک سامنے پا کر حیران اور پریشان ہو گئے۔۔۔

کچھ نہیں اماں ابا ان لالچی لوگوں کو انکی اوقات دکھا کر آئی ہوں اور ان کے منہ پہ ایسا طمانچہ مار کر آئی ہوں کہ پورے پنڈ نے آواز سنی

ہے گھبراو نہ اس نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔۔۔

کیا کہہ رہی تو انہوں نے ناسمجھی سے دیکھا،

ابا یہ چوہدری صاحب مجھے چھوڑنے آئے ہیں انکا شکریہ ادا کرو میں تب تک ان بھاری بھر کم کپڑوں سے نجات حاصل کرلوں۔۔۔"

وہ پرسکون لہجے میں کہتی ہوئی اندر کی طرف چلدی

جی چوہدری صاحب تشریف رکھوایتھے کنول اندر سے بڑا سا صوفہ سیٹ لے آئی شمسہ کے باپ نے احترام سے کہا چوہدری صاحب

صوفے پہ بیٹھ گئے۔۔۔ "

شکریہ بہت بہت آپکا چوہدری جی کیا سیوا کریں آپکی؟

نہ نہ کسی تکلف کی ضرورت نہیں رات ہو رہی اے اساں واپس وی جانا اے بس آپکی دھی کو خیریت سے چھوڑنے آئے تھے اپنی دھی کا

خیال رکھنا اس نے بہت بڑا فیصلہ لیا ہے مگر درست لیا ہے۔ ۔۔۔

مجھے تو ان کمینے لوگوں کی حرکت پہ ابھی تک طیش آ رہا ہے نامراد نہ ہوں تو۔۔

یہ کہ کر چوہدری رب نواز نے ساری تفصیل بتادی۔۔۔

چوہدری جی میری بیٹی حق بات کہنے سے کبھی نہیں ڈری مجھے فخر ہے اپنی دھی پہ ساری بات سن کر اسکا باپ لرزتی آواز میں بولا،

کون اے دروازے پر دروازہ آج ٹوٹ ہی نہ جاوے امداد کی ماں نے دروازہ زور زور سے کھٹکائے جانے پر اپنا تھل تھل کرتے

وجود کے ساتھ بمشکل اٹھی اور دروازہ کھولا۔۔۔ تو؟؟

وہ شمسہ کی غیر متوقع آمد پر چونکی۔۔۔ ہاں میں شمسہ دلیری سے مسکرائی،

اب کیا لینے آئی ہے یہاں دفع ہو جا۔۔ ۔

ہم نے اپنے بیٹے کی بات کہیں اور پکی کردی ہے وہ بدتمیزی سے منہ بگاڑ کر بولی۔۔۔

کچھ لینے نہیں کچھ دینے آئی ہوں کہاں ہے آپکا لاڈلا؟

وہ بینیازی سے پرس کھولتے ہوئے بولی اتنے میں امداد بھی دروازے پر آ گیا۔۔۔

کیا ہے اماں کون ہے دروازے پر اس نے ماں کو پیچھے ہٹایا اور سامنے کھڑی ہستی کو دیکھ کر جم کر رہ گیا۔۔۔

شمسہ نے ہینڈ بیگ سے ایک لفافہ نکالا اور امداد کے منہ پہ دے مارا۔۔۔

یہ لو خبیث لوگوں خلع کے کاغذ اور سائن کر کے بھیج دینا مجھے۔۔۔

سمجھ آئی شمسہ نے نفرت بھری نگاہ آخری بار دونوں پہ ڈالی اور اپنی اسی گاڑی میں بیٹھ کر انکی بدنظروں سے اوجھل ہوگئی۔۔۔۔"

یہ سچی کہانی ہے اس میں لڑکی کا نام اور گاوں کے نام آرضی ہیں

دعا اور آنسو

شائن ستارہ (لاہور)

وہ جائے نماز پر بیٹھی آج پھر اللہ کے حضور گر گرا رہی تھی اے اللہ، اے دو جہانوں کے مالک، پنجتن پاک کے صدقے مجھے اس اذیت سے نجات دے اگر وہی شخص میرا نصیب ہے تو مجھے صبر عطا فرما تا کہ تیری رضا کو اپنی رضا تسلیم کر سکوں اور اگر نہیں تو مجھے نجات دے اس شخص سے بھی اور اس اذیت سے بھی جو اس کی وجہ سے ہے میں اتنی بری ہوں کیا کہ وہ میرا نصیب بنے آنکھوں سے بہتے مسلسل آنسو اس کے گالوں کو بھگوتے ہوئے دامن میں جذب ہوتے جا رہے تھے وہ اکثر ایسے ہی اپنے رب کے حضور دعا مانگا کرتی تھی وہ جانتی تھی ایک اللہ تعالی کی ذات ہی ہے جو اسے اس تکلیف سے نکال سکتی ہے ایک وہی ذات ہے جو دلوں کے حال سے واقف ہے

وہ بارہا گھر والوں سے کہہ چکی تھی کہ وہ اچھا انسان نہیں ہے مگر کہیں سے بھی شنوائی نہ ہوتی تھی اور پھر ایک دن آ گیا جب اسے اس کی دعاں کا صلہ مل گیا اسے اس شخص سے نجات مل چکی تھی اس نے زندگی میں پہلی بار خود کو اتنا پرسکون محسوس کیا تھا پچھلے کچھ سالوں سے وہ جس ذہنی اذیت کا شکار رہی تھی آج اس سے آزاد ہو چکی تھی

دعائیں کبھی رد نہیں ہوتیں اس بات پر اس کا کامل یقین تھا مگر آج اس کا یقین اور مضبوط ہو گیا تھا کھڑکی کے پاس کھڑی گارڈن میں موسم بہار کے کھلتے ہوئے رنگ برنگے پھولوں کو دیکھا جو اسے اپنی طرف متوجہ پا کر مسکراتے محسوس ہوئے کچھ لوگوں کا زندگی سے چلے جانا ہی بہتر ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اپنے رب کی محبت کے اس پہلو سے کبھی آشنائی حاصل نہ کر پاتی اس نے مسکراتے ہوئے سوچا اور اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوگئی ایک بار پھر دعا کو ہاتھ اٹھے پھر اسی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی مگر اب کی بار یہ اذیت اور تکلیف سے نکلنے والے آنسو نہیں تھے بلکہ اللہ کی محبت میں سرشار، خوشی اور سکون کے آنسو تھے جو وہ دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہی تھی۔

آزادی

سالم خلیل

بالآخر ہم نے آزادی کا مطالبہ کیا، ان کی ظالمانہ حاکمیت سے تنگ آ کر، ہم نے آزادی کا نعرہ لگایا، ہم اک ایسا وطن چاہتے تھے، جہاں ہمیں اپنے حقوق کے حصول کیلیئے بولنے کی آزادی ہو، جہاں ہماری بہنوں، ماں اور بیٹیوں کی عزتیں محفوظ ہوں، جہاں ہم اپنے عقیدہ، ثقافت اور نظام حیات کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔

ہم نے آزادی کی جنگ لڑی، ہم نے اپنے بیٹوں، بزرگوں اور لاکھوں عالما اکرام کی قربانیاں دی، آخر کار اللہ کی مدد و نصرت کے ساتھ، ہمارے بزرگوں اور جوانوں کی قربانیوں نے رنگ لایا اور دنیا کے نقشے پر اک نئی اسلامی ریاست وجود میں آئی، پھر ہم نے اک نئے سفر کا آغاز کیا اور اس امید کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتے رہے کہ یہاں کوئی بھوک سے نہیں مرے گا، اپنے وطن کو ترقی پر گامزن کریں گے، یہاں ہماری بہنوں کو عزت کے کھو جانے کا ڈر نہیں ہوگا، جہاں میری بیٹی سب کی بیٹی ہوگی، جہاں میری بہن سب کی بہن ہوگی۔

لیکن نصف صدی سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی، آزادی ہم سے دور ہے، اسلام کے نام پر جس ملک کو ہم نے آزاد کروا کر آج جن کے ہاتھوں میں سونپا، انہوں نے اسلامی نظام کو چھوڑ کر مغربی نظام کو اپنا لیا، ہماری بچیوں کو اسلامی تعلیمات دینے کہ بجائے، عزت کا حجاب چھین کر، بھری محفلوں میں ناچنے کی تعلیم دی گئی، ہمارے حکمرانوں نے اقتدار کی ہوس میں، اپنوں کا ہی خون بہانا شروع کر دیا۔

ہم نے سوچا کہ اسلام کے نظام تحت حکومت ہوگی، وہ حکومت جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کی تھی، لیکن ہمارے حکمرانوں نے یزید کی حاکمیت کو اپنا لیا۔ لیکن وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا، امید کی کرن ابھی باقی ہے، ہم اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر سکتے ہیں، آج کا دور جمہوری ہے، اگر ہم ایسے حکمرانوں کا انتخاب کریں جو اپنے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کا درد رکھتے ہوں، تو انشا اللہ ان کے فیصلے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں ہوں گے۔

اب کے برس

عالی مان آفاقی

کچھ خواہشیں بڑی دور سے آتی ہیں _ عہد کے عہد گزار کر ...اپنے تشنہ تکمیل ماحول سے ایسے دیس کی طرف نکل چلی آتی ہیں جہاں وہ کھل کر کبھی نہ مرجھائیں _یا یہ کہ اگر مرجھانے لگیں تو دوبارہ کھل اٹھیں_

آج بھی اس اجڑے شکستہ مکان میں خالی زمین کی "تودہ دار "مٹی اور اس کی وسعت کے چہار دامن تکتے ہوئے اس کی سوچوں پر خواہش کا غلبہ تھا _اس ایک خواہش نے بچپن کا ایک عہد اس کے ساتھ گزار دیا تھا: جب اسٹیل کی چمکدار اور چہرہ دکھانے والی "سماوار" اپنے اندر کھولتے پانی سمیت نیچے دہکتے کوئلوں کی تپش کو راکھ کے حوالے کر رہی ہوتی تھی _ سبز چائے کی چند ایک پتیوں کے سماوار میں ڈالے جانے تک وہ چپ چاپ کالی چمکیلی آنکھوں سے سماوار کو تکتا رہتا _ نیچے سے کوئلے جھڑنے کے بعد جب سماوار سے چائے جامنی پھول دار پیالیوں میں انڈیلی جارہی ہوتی تو دار چینی اور صندل کی من لبھاتی خوشبو کے نتھنوں سے معدے میں منتقل ہونے سے پہلے ہی اس کے دل میں دبی خواہش فزوں تر ہو جاتی_

"چاچی !میں بڑا ہو کر اپنا بہت بڑا گھر بناں گا ،جس کی دیواریں جامنی ہوں گی _بالکل اپنی ان چائے کی پیالیوں کی طرح_،،وہ دن کی ہر پہلی چائے کے ساتھ اپنی اس خواہش کا اظہار اپنی چچی سے کرتا تھا_

"اس گھر میں رہے گا کون بیٹا!،، چچی نے نجانے کیا سوچ کر اس سے پوچھا تھا_

"لو جی !میں خود رہوں گا اور کون رہے گا_،، وہ اپنی خاص ترنگ میں کھلکھلا اٹھا_

"بے وقوف !گھر میں تو عورتیں رہتی ہیں_،،

"تو عورت لانا کون سا مشکل کام ہے؟میں شادی کر کے عورت لے آں گا _اور پھر تو نے کہاں جانا ہے؟تو بھی تو میرے ساتھ عمر بھر رہے گی ناں چاچی!،،وہ قیافہ شناس لہجے میں بولا تھا _چاچی آسمان کو تک کر رہ گئی تھی_

"اب تو تو بڑی بڑی باتیں بھی کرنے لگ گیا ہے _اچھا بتا !کس کا جماترا) داماد (بنے گا؟،،

"تیرا بنوں گا_،،یہ اکثر ہوتا تھا کہ وہ چچی کے اس سوال پر ہنس کر نا سمجھی کے عالم میں کہہ دیتا تھا اور چاچی چولہے کی آگ میں پھونکیں مار مار کر ہلکان ہو جاتی _ سرخ چہرے کے ساتھ کھل کر ہنستی اور اس کے سانولے چہرے پر پیار کر کے کہتی:

"جھلے آ !میری تو کوئی دھی نہیں ہے_،،

"لے !جماترا ہونے کے لیے بھلا دھی کی کیا ضرورت ہے؟،،

اس کی کئی بار کہی ہوئی اس بات سے محظوظ ہو کر چاچی کھلکھلا کر ہنسی تھی اور اس کے بالوں بھرے سر پر ہلکی سی ایک چپت لگا دی تھی_

"جھلا ہے تو کملا ہے _آج تجھے بتاں گی کہ جماترا کیا ہوتا ہے؟چل اٹھ !پہلے اپنے چاچے کو چائے کا پیالہ پکڑا دے_،، وہ ہونق بن

گیا _ چائے کا پیالہ پکڑا اور احتیاط سے باڑے کی طرف قدم اٹھانے لگا، جہاں کھرلی پر گھاس کھاتی بھینسیں ڈکرا رہی تھیں _ چچی لمبے کیل سے چولہے کی راکھ کرید نے لگی _ ایک طویل خاموشی آن ٹھہری جس نے سوچوں کی آمد کے لیے سازگار حالات فراہم کر دیے تھے _ وہ ماضی قریب میں کھو گئی _

شام کے دھندلکے میں چپکے سے تاریکی در آئی تھی _ مکان کے داخلی دروازے پر دستک ہوئی _ نجانے کیوں ندرت کے قدم لرز اٹھے _ دستک کا انداز عجلت زدہ تھا _ ندرت نے فوراً اپنے پیروں پر قابو پالیا اور قدم جما کر دروازے کی طرف چلنے لگی _ رات کے وقت میں ٹمٹماتی شمع کے نیچے اپنا سبق دہراتا فراز بھی اس کے پیچھے دروازے تک چلا آیا _ وقت کو انتظار تھا کہ ندرت دروازہ کھولے اور وہ اپنا ایک نا بھولنے والا لمحہ اس پر وار دکر دے .اور وہ لمحہ اس پر وارد ہو گیا، جس سے وہ کسی طور پیچھا نہیں چھڑا سکتی تھی _ عمر بھر بھی نہیں _ اس نے لکڑی کے دروازے سے لوہے کا راڈ نکالا اور پٹ وا کر دیے _ چند لمحے تاریکی میں گومگو کی کیفیت میں گزرے، پھر اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی تھی جس نے مکان کے در و دیوار ہلا دیے تھے _ فراز ڈر کر دروازے سے جا لگا تھا _ ندرت لہرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی _ اس کا شوہر اور ایک مقامی آدمی آگے بڑھے .. ندرت کو اٹھا کر ایک طرف چارپائی پر لٹایا اور دو اسٹریچر دروازے سے گزار کر صحن کی طرف لے گئے، جن پر ندرت کا دیور عزیز اور اس کی بیوی جہاں آرا مردہ حالت میں پڑے تھے _

جہاں آرا رشتے میں ندرت کی بڑی بہن تھی، جو بڑے چا سے اسے بیاہ کر اپنے ہی گھر لے آئی تھی _ عزیز سے تو اسے بڑے بھائی جیسا لگا تھا اور وہ بھی اسے چھوٹی بہن کی طرح اپنے احترام کا موقع دیتا تھا _ اس کی یہ دونوں عزیز ترین ہستیاں پلک جھپکتے ہی زندگی کی سرحد پار کر گئی تھیں _ ابھی کچھ دیر پہلے ہی عزیز اور جہاں آرا اپنی بائیک پر عید کی شاپنگ کے لیے گھر سے نکلے تھے _ سڑک کراس کرتے ہوئے ایک ہیوی ٹرالر ان کی بائیک سے ٹکرا گیا تھا _ یوں فراز اپنے ماں باپ سے، ندرت اپنی بہن سے اور اس کا شوہر جمیل اپنے بڑے بھائی سے محروم ہو گیا تھا _

"مجھے یاد ہے جب مجھے ہوش آیا تھا تو تو میرے ساتھ لپٹا ہوا تھا _ اپنے ماں باپ کو دیکھ دیکھ کر روئے جا رہا تھا _ فراز نے خالی پیالہ سماوار کے ساتھ رکھا ہی تھا کہ ندرت نے یہ کہتے ہوئے اسے جھپٹ کر گود میں اٹھا لیا تھا _ اس کے سانولے چہرے پر پیار کرتے ہوئے ندرت کی آنکھوں سے نکلے گرم موتی فراز کے گالوں کو بھگوتے جا رہے تھے _

"بوا ! مجھے چائے دو .. ناشتہ کرنا ہے _،، دفعتاً تحکم آمیز لہجے کی ایک کھنکھناتی آواز سنائی دی _ ندرت نے فراز کو اپنے سے علیحدہ کیا اور چولہے کی دیوار کے ساتھ آ کھڑی ہونے والی اپنی بھتیجی سمیرا کے ہاتھ سے کپ لیا اور اس میں چائے انڈیلنے لگی _ وہ کچھ دن کے لیے گاں سے اپنی پھپھو کے گھر رہنے کے لیے آئی تھی _ فراز نے سمیرا کو دیکھا تو خوش ہو گیا _ تھوڑا کھسک کر چھوٹی سی دیوار کے پاس اس کے لیے جگہ بنائی _ سمیرا بھی اس جگہ پر بلا تکلف بیٹھ گئی اور اپنے ساتھ لائے ہوئے توس چائے کے ساتھ کھانے لگی _

"لو تم بھی کھا!،، یہ کہہ کر اس نے ایک توس فراز کی طرف بڑھایا _

" کھلانے ہیں تو پورے آدھے کھلا _ ایک سے کیا ہوتا ہے _،، فراز وہ ایک توس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور منہ کے قریب لے جا کر

بیٹھ گیا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کھاں یا نہ کھاں _

"اچھا !اور بھی دیتی ہوں پہلے یہ تو کھا_،،سمیرا نے خفگی سے کہا اور توسوں کا چھوٹا سا شاپر اس کی طرف بڑھایا " _ آدھے نکال لو اس میں سے _،،

"ایسا کرتے ہیں دونوں مل کر کھاتے ہیں _،،فراز نے شاپر کھول کر اس کے سامنے رکھا اور ایک توس اٹھا کر سمیرا کی طرف بڑھایا _ وہ ہنس دی _ ندرت کے ہونٹوں پر آسودگی آمیز مسکراہٹ پھیل گئی _

A~ ~ ~ FOR ~ ~ ~A

بچپن گزرا _ سہانا وقت گئے زمانے کی جھلک بن گیا _ ایک انجانا سا شعور مل گیا تھا اسے کہ اب دل کے گداز حصوں میں جنم لیتی سوچ احساس کی سیڑھیوں پر چلتی خیالات کے منظر خانوں میں اترنے لگی تھی _ آج پہلی بار اس نے اپنی سوچوں کو منتشر ہونے سے بچانے کے لیے ڈائری کا سہارا لیا تھا _

اب کے برس اک کام کرنا

کورا سا اک کاغذ لے کر

دکھ سکھ سارے لکھتی رہنا

اور خوشیاں غم شمار کرنا

دکھ ہو یا کوئی غم

پریشان نہ ہونا

میری خوشیاں تم لے لینا

اپنے غم میرے نام کرنا

اب کے برس اک کام کرنا

آج صبح سے ہی سمیرا کا موڈ آف تھا _ بار بار ہاتھوں کی مٹھیاں کھلنے اور بند ہونے لگتی تھیں . یہ اس کے غصے کا اظہار تھا _ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ دیوار پر مکے مارے _ لیکن "اے آرزو بسا کہ خاک شدہ " کے مصداق اپنے ہی ہاتھوں پر تکلیف کے احساس سے گھبرا کر رہ جاتی _ اس آف موڈ کی وجہ اس کی سہیلی یسری تھی، جو کل شام اس سے رخصت ہوتے ہوئے صبح پھر آنے کا کہہ کر چلی گئی تھی _

"سمیرا !مائی سویٹ فرینڈ !میں صبح آں گی _،،یسری کے کہنے پر اس نے غصے سے بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا _ یسری گڑبڑا گئی اور اسے جلدی سے اپنے الفاظ بدلنے پڑے تھے _

"میں وعدہ کرتی ہوں صبح ضرور آں گی _ پکوان کے ساتھ میٹھا ضرور بنانا .. گپ شپ چلے گی . پلیز اب مجھے جانے دو _،، اس کے خفگی سے بھرپور چہرے پر پیار کر کے یسری کھلکھلاتی ہوئی چلی گئی _

دوسری صبح سمیرا فجر کی ادائیگی سے فارغ ہی مصروف جو ہوئی تو مکمل طور پر فارغ ہو کر ہی کچن سے نکلی _ اس نے یسری کی فرمائش پر اپنی

پسندیدہ ڈش ولایتی کھیر تیار کی تھی _ کوفتے اور نان تو اس نے خاص طور پر بنائے تھے _ مگر جب انتظار کرتے کرتے گیارہ بج گئے اور مقررہ وقت سے دو گھنٹے اوپر ہو جانے پر بھی یسری کی آمد کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو موڈ کا آف ہونا تو لازمی تھا _ اب وہ زخم کھائی ہوئی بلی کی طرح بے چین ہو کر صحن میں چکراتی پھر رہی تھی _

"سمیرا بیٹا ! آخر کوئی تو وجہ ہو گئی ہو گی جو وہ نہیں آ پائی _ آخر کو ہزار مسائل ہوتے ہیں انسان کے _ شادی شدہ افراد تو ویسے بھی زیادہ مصروف ہو جاتے ہیں _،، اس کی ماں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ندرت نے اس کی پریشانی کو بھانپ کر اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی _

"بس کریں بوا ! اب آپ بھی اس کی طرف داری کریں گی _ شادی کے بعد وہ اور بھی زیادہ بے وفا ہو گئی ہے _ اپنی وعدے پر بھی نہیں آئی _،،

"اچھا تھوڑا اور انتظار کر لو ! ہو سکتا ہے راستے میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہو _،،

"مجھے پہلے ہی پتہ تھا وہ نہیں آئے گی _ میسنی ہے پوری .. اب کل یا پرسوں آ کر کوئی عذر گھڑے گی _،،

"بیٹی ! اگر تمھیں پتہ تھا کہ وہ نہیں آئے گی تو پھر اتنا انتظام کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟،، ندرت نے مسکراتے ہوئے اس کے بازو پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا اور واپس امی کے پاس جا بیٹھی _ سمیرا نے چونک کر ندرت کی طرف دیکھا اور پیر پٹختی کچن کی طرف دوڑ گئی _ یسری کے لیے بنائی گئی ہر چیز محفوظ جگہ پر ٹھکانے لگا کر وہ واپس برآمدے میں آئی تو چونک اٹھی _

فراز ندرت اور امی کے ساتھ بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا _ وہ ٹھٹک گئی _

"تو صاحب بہادر بھی بوا کے ساتھ تشریف لائے ہیں _،،

نسوانی حجاب مزید آگے بڑھنے سے مانع ہو گئی تھی _ وہ واپس پلٹنا ہی چاہتی تھی کہ امی بول اٹھیں :

"ارے سمیرا بیٹا ! اپنے ہاتھوں سے بنے ہوئے کوفتے اور کھیر فراز کو نہیں کھلاؤ گی ؟،،

"وہ ... امی ... دراصل میں نے ... وہ وہ سکتا ہے کہ یسری ....،، وہ گڑبڑا کر رہ گئی _

"ارے کیا ہو جائے گا _ کم تو نہیں ہو جائیں گے _ بلکہ فراز چکھ کر بتا دے گا کہ کون سی ڈش اچھی بنی ہے _،، ندرت بولی _

"وہ دراصل میں خود ہی کچن میں فراز صاحب کے لیے لینے جا رہی تھی _،، وہ بات بناتے ہوئے بولی _

"انداز تو نظر انداز کرنے والا تھا _،، فراز کہاں پیچھے رہنے والا تھا _ بول ہی پڑا _

"نہیں ! ایسی بات نہیں .. آپ بیٹھیں میں ابھی لائی _،،

"محترمہ ! میں بیٹھا ہی ہوا ہوں _،، فراز کے جتاتے انداز پر وہ جھینپ گئی اور کچن کا رخ کیا _

"سمیرا بیٹی !،،

"جی امی جان _،،

"ارے بیٹی !فراز کے لیے ایک کپ چائے تو بنا دو_،، امی نے آواز لگائی

"اچھا امی جان!،، سمیرا نے آہستگی سے کہا_

"آج یہ صاحب پھر آن دھمکے_،،

دفعتاً ہی سمیرا کی بڑی بہن حمیرا کمرے میں داخل ہوئی اور سمیرا کو سوچوں میں گم دیکھ کر بولی:

"ارے سمیرا ! کیا ہوا؟ کس سوچ میں غلطاں ہو؟،،

"باجی کچھ نہیں_،،سمیرا چونک گئی "_بس میرا موڈ آج آف ہے_،،

"وہ تو نظر آ رہا ہے _بتانے کی ضرورت ہی نہیں_،، حمیرا ازراہ مذاق بولی تھی_

"باجی !دراصل بات یہ ہے_،، سمیرا نے لجاجت سے کام لیتے ہوئے کہا "_وہ دراصل بات یہ ہے کہ یسری کے گھر تمام فرینڈز نے کوکنگ کا پروگرام بنایا ہے _سب پہنچ گئی ہونگی اور میں ابھی تک_،،

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟امی سے اجازت لو اور چلی جا_،، حمیرا کی مسکراہٹ میں حیرانی کا عنصر تھا_

"یہی تو اصل مشکل ہے باجی !پلیز تم اجازت لے دوناں !امی کے ساتھ فراز صاحب بیٹھے ہیں _مجھے شرم آتی ہے_

ردالفساد

ہادیہ امجد

اپنے آٹھ ماہ کے بیٹے کو وہ دودھ پلا کر اپنی ساس کی پاس کھیلتا چھوڑ کے وہ کچن میں دوپہر کا کھانا بنانے جانے لگی تو ٹی وی پر جہاں پہلے کوی پروگرام چل رہا تھا اسے روک کے کوی بریکنگ نیوز سنای جانے لگی۔وہ وہیں کچن کے دروازے میں کھڑے ہو کر خبر سننے لگی۔

آج کی تازہ ترین خبر۔ہم دے رہے ہیں آپکو سب سے پہلے۔آپریشن ردالفساد جو تقریبا ایک ماہ پہلے پورے پاکستان خصوصا بلوچستان اور ڈیرہ غازی خان میں دہشت گردی کے خلاف شروع کیا گیا اس میں آج گیارہ فوجی شہید ہو گے ہیں۔شہید ہونے والوں میں سیالکوٹ کے میجر زوہیر بھی شامل ہیں۔ہم آپکو سب سے پہلے بتا رہے ہیں کہ۔۔

نیوز کاسٹر چنگاڑتی ہوی آواز میں تازہ صورتحال کی خبر سنا رہی تھی مگر اس سے اِس سے آگے سنا نہیں گیا۔پہلے لگا کہ اسے سننے میں غلطی ہوی ہے مگر سکرین پر میجر زوہیر ہی کی تصویر اسکے نام،عہدے اور کارگردگی کیساتھ دکھای جا رہی تھی۔اس کا جسم سن ہونے لگا اور اسے اپنی ہی کیفیت سمجھ نہیں آ رہی تھی۔وہ وہیں زمین پر بیٹھتی گی۔اسکی ساس روتے ہوئے آوازیں دے رہی تھی۔اسکا بیٹا الگ رو رہا تھا۔نیوز کاسٹر الگ چیخ رہی تھی اور تو اور گلی میں سبزی والا آ کر الگ اپنی بولی لگانے لگا۔اسےکچھ نہیں سن رہا تھا سوائے کہ سیالکوٹ کے میجر زوہیر شہید ہو گے۔

ارے فزا اپناز وہیز چلا گیا۔چلا گیا ہمیشہ کیلیے۔سن رہی ہے نا۔اس کی ساس اپنے روتے ہوئے پوتے کو اٹھائے اسکے پاس کچن کے

دروازے میں آ کر کہنے لگی مگر اس پر تو کوی سکتہ طاری تھا۔فزا۔انہوں نے اسے پھر بلایا تو اس نے خالی نظریں اٹھا کر ساس کو دیکھا اور ان سے بچہ لیتے ہوئے اس چپ کروانے لگی۔

کیا یار۔ایسے کرو گی پھر تو میں نہیں جا سکوں گا نا۔زوہیر نے اسے کندھوں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔یہ ایک مہینہ پہلے کی بات ہے جب اسکی ڈیوٹی بلوچستان کی علاقے میں لگی تھی تو یہی بات سن کر فزا پریشان تھی کہ عام دنوں میں ہی وہاں کے حالات اتنے خراب رہتے ہیں اب تو آپریشن کیلیے بلایا تھا۔

زوہیر۔جی میری جان۔

ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ اپنا ایریا بدلوالیں۔میرا مطلب ہے آپریشن کی جگہ کہیں اور۔اس نیکچھ کہنا چاہا۔

فزا۔کسی باتیں کرتی ہو۔ایسا کیسا ہوسکتا ہے اور مجھے بتاو بھلا یہ کیا بات ہوی کہ جب میرے وطن کو میری ضرورت ہے تو میں پیچھیہٹ جاں۔زوہیر نے اسے سمجھایا۔

لیکن میرا دل بہت گھبرا رہا ہے کہ ہو نہ جائے۔

شہادت کا رتبہ قسمت والوں کو ملتا ہے۔کیا تمہیں اچھا نہیں لگے گا کہ میں ان خوش نصیبوں میں شامل ہوسکوں۔زوہیر نے کہا۔

ٹھیک ہے۔اللہ آپ کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔

ایسے تھوڑی۔مسکرا کر رخصت کرو ورنہ ڈیوٹی پر بھی تمہاری طرف دھیان رہے گا۔اس نے اس کی ناک کھینچتے ہوئے کہا وہ ہلکا سا مسکرا دی۔

یہ ہوی نا اچھے بچوں والی بات اور تمہاری دعایں میرے ساتھ ہیں تو فکر کیسی۔اچھا چلتا ہوں دیر ہو رہی ہے۔یہ کہہ کر اس نے اس کے سر پر بوسہ دے کر اپنے بیٹے کو پیار کیا اور اپنا سامان اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔پیچھے اپنے امڈتے آنسو اندر دھکیلتی فزا نے بیٹے کو اٹھایا اور زوہیر کو اللہ حافظ کہنے باہر نکل گی۔نا جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے عزیز از جان شوہر کو آخری مرتبہ دیکھ رہی تھی۔

دیکھو میری ڈیوٹی میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔میرے سے وعدہ کرو کہ اگر کبھی کچھ ہوجاتا ہے تو وعدہ کرو کہ تم روگی نہیں بلکہ صبر سے کام لیتیہوئے اماں کو سنبھالو گی اور اسکا بھی خیال رکھو گی۔زوہیر نے اپنے بیٹے کو پیار کرتے ہوئے ذرا سی نظریں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں آپ۔

بھی فوجی کی بیوی ہو تم۔تمہیں تو مضبوط ہونا چاہیے اور تم۔

ہاں کو دھڑکا لگا رہتا ہے ہر وقت آپکی طرف سے۔

تم بھی۔کیا میں؟

کچھ نہیں۔وعدہ کرو۔

زوہیر۔وہ بیبسی سے بولی۔وعدہ؟

وعدہ۔دو آنسو نکل کے اسکے گال بھگو گے۔اس نے یہ ایک لفظ کتنی دقتوں سے بولا تھا یہ وہ جانتی تھی۔

شاباش۔زوہیر نے اس کو ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

وہ دروازے میں کھڑی اسے رخصت کر رہی تھی تو اس سے پچھلی بار ڈیوٹی پر جاتے ہوئے جو کچھ زوہیر نے اس سے کہا تھا،اسے یاد آنے لگا اور ساتھ ہی اسکی آنکھوں کے گوشے بھیگ گے۔دروازہ بند کر کے وہ اندر اپنے کمرے میں آ گی۔ہر طرف اداسی چھائی تھی۔اسکا اندر بھی ویران ہو گیا تھا اور ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔اب بھی اس کے کچھ دن ایسے ہی گزرنے تھے۔

کب میجر زوہیر کا جسدِ خاکی سبز پرچم میں لپٹ کر گھر آیا۔کب سپرد خاک کیا گیا۔اسے کچھ پتہ نہ چلا۔وہ ہوش وحواس سے بیگانہ بیٹھی اپنے شوہر کی میت کو گھورتی رہی۔ایک آنسو تک نہ نکلا اسکی آنکھ سے۔وہ سر گھٹنوں پر رکھ کر ویران نظروں سے ارد گرد دیکھ رہی تھی کہ ایک دم اسے اپنے مجازی خدا سے کیا وعدہ یاد آیا۔جو آنسو اسکی میت اٹھانے کے بر داپنی ساس اور دوسری روتی عورتوں کو دیکھ کے آ رہے تھے انہیں صاف کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوی اور اپنی ساس کے پاس جا کر انکی بلکتی حالت کو سنبھالنے لگی۔اسے کمزور نہیں پڑنا تھا بلکہ مضبوط بننا تھا۔کیونکہ وہ ایک فوجی کی بیوی تھی۔اسے اپنا وعدہ نبھانا تھا۔

ساس بہو کی نوک جھونک

نبیلہ خان

اے بی: ہمارے وقتوں میں بہوؤں کی مجال نہیں ہوتی تھی کہ پلٹ کے کچھ پوچھ ہی لیں

اللہ بخشے میری ساس کو... انکے سامنے تھر تھر کانپتے تھے

ایک ہماری بہو ہے مجال ہے کسی بات میں ہم سے مشورہ تو دور کی بات، بھنک ہی نہیں پڑنے دیتی....

بالا ہی بالا تمام معاملات طے کرنے کے بعد شوہرِ نامدار کو این اوسی جاری کرتی ہے کہ چلو اب اماں باوا کو بتا دو جو کارنامہ وہ سرانجام دے چکی ہوتی ہے محترمہ....

میری ساس محلے کی پھا پھا کٹنی: زکیہ خالہ کے سامنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں مصروف تھیں

ارے اماں: آپ کیوں زکیہ خالہ کو اپنے گناہوں مین شامل کر رہی ہیں پہلے ہی بیچاری کی نیکیاں گنی چنی ہیں

اوپر سے آپ غیبت کر کے انکی اور اپنی نیکیاں میرے کھاتے میں ڈالنے میں مصروف ہیں...

میرے اچانک کمرے سے باہر آنے پر دونوں خواتین کے چہرے دن رات کا منظر پیش کرنے لگے..

ارے بہو: میں تو اپنی ساس کی سخت گیری کو بتا رہی تھی کہ کیسے ہم چاروں بہوؤں کی گردنوں پر پیر رکھے رکھتی تھیں،،،،

اللہ انہین کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے

اماں بیچاری بغلیں جھانکتے ہوئے بات کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں جبکہ زکیہ خالہ نے جھٹ برقع سر پہ رکھا اور اماں کو سلام جھاڑتے ہوئے باہر کی راہ لی،،،

میں نے گیٹ سے جھانکا تو اسے صفیہ کے گھر میں گھستے دیکھا تا یقین ہو گیا کہ وہ ابھی کی تازہ کاروائی اسکے گوش گزار کر کے ہی سکون پائے گی ، کیونکہ اسکی خود اپنی بہووں سے کبھی بنی نہیں تھی اس لیے ہر ساس بہو کو آپس میں لڑوا کر اسکی بے چین روح کو شاید کچھ تسکین ملتی تھی

میں نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے سوچا کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے اور عورت ہی ظالم ومظلوم

اماں یہ دیکھیں آپ کے لیے یہ سوٹ لائی ہوں پرنٹ دیکھیں؟

مجھے آپ کے لیے یہ بہت پسند آیا تو سوچا لے لوں...

میں نے سوٹ اماں کی گود میں رکھتے ہوئے اماں کے چہرے کی طرف اس امید سے دیکھا کہ شاید انہیں خوشی ہو گی

جہاں ایک لمحے کو تو واضح پسندیدگی جھلکی مگر دوسرے لمحے اماں نے دوبارہ سے بیزاری طاری کرتے ہوئے سرسری سا دیکھ کر ایک سائیڈ پر رکھتے ہوئے کہا

اے بہو: اس کی کیا ضرورت تھی ، اچھے بھلے کپڑے تو ہین میرے پاس ، بلا وجہ کا خرچ دیتی ہو بات بات پہ

ویسے بھی میرے بچے کی حق حلال کی کمائی ہے ، یوں بات بات پہ خرچ کرنا ٹھیک نہیں ، خون پسینہ ایک کر کے کماتا ہے تب گھر کی دال روٹی چلتی ہے اور تم منٹوں میں اڑا

دیتی ہو،، میں جو اماں کا دل جیتنے کے لیے جانے کیا کیا جتن کرتی تھی سب کچھ دھرے کا دھرا رہ جاتا . اماں میرے لائے گیے تحفوں کے جواب میں اپنی ساس کے قصے لے کہ بیٹھ جاتیں ،

آپ بھی نا اماں : کیا کیا سوچتی رہتی ہیں

" ثاقب " کوئی مزدور تھوڑی ہیں ، ملٹی نیشنل کمپنی کے مالک ہیں سارا سارا دن اے سی کہ ٹھنڈی ہواوں مین رہتے ہیں چار چار گاڑیوں کے مالک ہین چھ ماہ ملک سے باہر رہتے ہیں ، مگر آپ تو اتنا دردبھرا نقشہ کھینچتی ہین کہ جیسے سارا دن اینٹ گارا ڈھوتے ہیں اور میں انکی کمائی اڑا دیتی ہوں

مین نے خاصہ بدمزہ ہوتے ہوئے بات کو مزاق مین اڑانا چاہا...

ہاں ہاں تم تو چاہتی یہی ہو کہ اب میرا بچہ بیچارہ اینٹ گارا ڈھوے

اری ناشکری عورتین ہی ہیں اجکل کی ،،،

کام کی نہ کاج کی ، دشمن اناج کی ،،

اماں کی لن ترانی پر مین ہکا بکا انہین دیکھتی رہ گیی اور وہ سوٹ کو بغل میں دبائے یہ جا وہ جا ،،، واقعی سچ ہے ، دنیا کی کبھی نہ راضی ہونے " مخلوق " عورت ہی کہلاتی ہے

خوش بختی سے بد بختی تک

عالیہ ذوالقرنین

احسن سیٹی کی دھن پر "دل تو بچہ ہے جی .. تھوڑا کچا ہے جی " گنگناتا سکیٹنگ شوز پہنے ہوا میں لہراتا ہوا گزرا کہ سسکیوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی- وہ گھوما، غور کیا اور اس کی نظر قریب موجود بینچ پر منتشر بالوں، ملگجے بوسیدہ لبادے میں ملبوس سر جھکائے ایک بوڑھے پر ٹک گئی-

"بڑے میاں ! یہ آپ رو رہے ہیں نا کیا ہوا آپ کو؟ کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟"

بوڑھے نے جھکا ہوا سر اٹھایا ہاتھوں کا چھجہ بنا کر آنسو بھری سرخ آنکھوں سے احسن کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں گویا ہوا؛

"ہاں یہ رونا میری ہی قسمت میں لکھا ہے"-

" کیا میں آپ سے وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"احسن نے استفسار کیا-۔۔۔ وجہ !

"آپ پہلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں؟ "احسن اب شاید کچھ چڑ کر بولا-

"پہلیاں میں کیوں بجھوانے لگا ! پہلی تو میری ہی بن چکی ہے-

یہ دیکھ رہے ہونا! بوڑھے نے سامنے مینار پاکستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا-

"یہ چھہتر سال پہلے اس سنہری یاد کی نشاندہی ہے جب مسلمان صرف مسلمان تھے -ان میں مسلک اور فرقے تو تھے مگر وہ فرقوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے -یہ اس عظیم وقت کی یاد تازہ کرتا ہے جب شیر بنگال نے مولوی فضل الحق نے قرارداد پیش کی تھی کہ مسلمان ایک الگ نظریاتی قوم ہیں اس لیے ان کو رہنے کے لیے بھی ایک الگ وطن ہی چاہیے اور بھلا تم ہی بتا انگریزوں سے آزادی کے بعد اس قوم کے ساتھ کیسے کیسے رہا جا سکتا تھا جو مسلمانوں کو "ملیچھ " کہتے تھے -بوڑھے نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا-

"بزرگو ! میں نے آپ کے رونے کی وجہ پوچھی تھی آپ مجھے تاریخ سنانے لگ گئے احسن نے کچھ بیزاری سے کہا-

"تاریخ نہیں سنا رہا اپنے رونے کی وجہ بتا رہا ہوں اب یہ میری بدقسمتی کہ میرے رونے کی وجہ ہی تاریخ پاکستان ہے

کہ ہم نے اس عہد کو بھلا دیا ہے جس کو پورا کرنے کی خاطر ہمارے آبا اجداد نے پاکستان کے قیام کی جدوجہد کی تھی۔ جس کی خاطر لاکھوں مسلمانوں نے اپنے گھر، کاروبار اور جانیں تک قربان کردی تھیں۔ اس وقت کسی نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگا کہ سیکولر؟ کسی نے اپنے برانڈ کے اسلام کی نفاذ کی بات نہیں کی تھی۔ یہ سارے سوال ہی بے محل اور غیر ضروری تھے۔ ان کے سامنے تو ایک ہی مقصد اور منزل تھی، اور وہ منزل تھی، مسلمانان ہند کے لئے الگ مملکت کا قیام اگر صرف نماز، روزہ ہی کافی تھا، تو اس کی اجازت تو متحدہ ہندوستان میں بھی تھی۔

اس وقت ایک جذبہ تھا، ایک لگن تھی، ایک آرزو تھی، کہ کسی طرح مسلمانوں کو آزادی مل جائے اور وہ اپنے عقائد کے مطابق زندگی گزار

سکیں۔اس جدوجہد میں علما بھی تھے،انگریزی تعلیمی اداروں سے پڑھے ہوئے لوگ بھی تھے،نوکر پیشہ لوگ بھی تھے اور کھیتوں میں کام کرنے والے بھی۔ان سب نے مل کر اپنا کل،ہمارے آج پر قربان کر دیا،تاکہ ہم ایک آزاد وطن میں سانس لے سکیں۔پتہ نہیں کیوں 23مارچ1940 کی تصاویر دیکھتے ہوئے مجھے 16دسمبر1971یاد آجاتا ہے،اور وہ تصویر جس میں پاک فوج کے کمانڈر ہندوستانی فوجیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے معاہدے پر دستخط کرتے ہیں۔ہندوستانی فوجیوں کے چہروں پر معنی خیز مسکراہٹ ہے،اور ہمارے جوانوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔جس دو قومی نظریہ کی بات ہم نے 23مارچ1940 کو کی تھی،اس کا بدلہ انہوں نے ہم سے لے لیا۔کتنی جلدی ہم نے اپنے آبا اجداد کی محنت پر پانی پھیر دیا؟کتنی آسانی سے ہم نے ادھر تم،ادھر ہم کے نعرے میں آدھے پاکستان کو کھو دیا اور پھر اس سے بھی سبق حاصل نہ کر سکے۔

بوڑھے نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا اب احسن چہرے پر دکھ کے تاثرات با آسانی دیکھے جا سکتے تھے -اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا -بوڑھا شخص ٹھنڈی آہ بھر کر دوبارہ گویا ہوا-

۔ہم نے سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ لگا کر سب سے پہلے پاکستان ہی کو داؤ پر لگا دیا-

رہی موجودہ حالات کی بات،تو جہاں پر یہ معلوم نہ ہو کہ دشمن کون ہے اور دوست کون؟اس سے ابتر صورت حال کیا ہو سکتی ہے؟آج ہماری نسل ہم سے سوال کرتی ہے کہ ہم نے پاکستان کیوں بنایا؟اور میرے پاس ان آنسوں کے علاوہ اس کا کوئی جواب نہیں .. کوئی جواب نہیں

بوڑھے نے ایک سسکی لی اور اٹھ کھڑا ہوا-

" مگر آپ نے اپنے بارے میں نہیں بتایا؟

"میں پاکستان ہوں ...ایک تھکا ہارا پاکستان ... ستر سال پہلے اس وقت قوم کو ایک ملک کی ضرورت تھی اور آج ملک کو ایک قوم کی ضرورت ہے۔۔بدبختوں نے اسلام کے نام پر اپنے اپنے مفاد کی جنگیں لڑ کر مجھے تباہ و برباد کر دیا کاش ! کہ تم سمجھ سکتے کاش !

جھکی ہوئی کمر اور لرزتے جسم والا بوڑھا بغیر مڑے گویا ہوا اور اپنے آنسو پونچھتا آگے بڑھتا چلا گیا-

---

میرا دیس

آمنہ غفور (کوٹ چوٹا)

ہر جگہ ہریالی ہی ہریالی تھی ایسا منظر اس نے کبھی امریکہ میں بھی نہیں دیکھا تھا آج اس کی پہلی صبح تھی پاکستان میں اور وہ بھی اتنی خوبصورت صبح اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی جنت میں آ گئی ہو وہ اپنے ابا عبداللہ سے جھگڑ کر پاکستان آئی تھی وہ اکثر خود مل کر اماں بی اور ابا جان سے مل کر چلے جاتے تھے انہیں اپنا گاؤں بلکل بھی پسند نہیں تھا وہ اپنے بہن بھائیوں

میں مختلف سوچ کا ملک تھااور رمشہ کی پیدائش سے پہلے ہی امریکہ چلے گیا تھا پر رمشہ ان کے برعکس مختلف تھی اسے اپنا وطن بیناد کھے بہت عزیز تھا۔

بابا آپ کب آو گے۔۔رمشہ کو دادا دادی کے پاس آئے تیسرا ماہ تھا اور عبداللہ رمشہ کو جب بھی بولانے کی بات کرتا تو وہ اسے کہتی کے اپ کب آ رہے ہیں۔۔

ناجانے دوسری طرف کیا کہا گیا تھا کے رمشہ اداس سی ہوگئی تھی۔۔۔بی بی جان بابا کو پاکستان کیوں نہیں پسند۔۔

بیٹا اسے لگتا تھا یہاں کے لوگ اچھے نہیں ہیں حکومت ہماری عزت نہیں کرتی ہے قتل، ڈکیتی بہت کچھ تھا پر اب تو بہت کچھ بدل گیا ہماری آرمی نے یہاں کیا کچھ بدل ڈالا ہے۔۔۔بی بی جان اسے بتا رہی تھی اور وہ غور سے سن رہی تھی۔۔۔

کیا ہوا میری گڑیا رانی اکیلی کیوں بیٹھی ہے بابا یاد آ رہے ہیں۔۔۔وہ ہاتھوں کا پیالہ بنائے بیٹھی تھی

جی دادا جان بابا کی وجہ سے ماما بھی نہیں آ رہی۔۔۔

ہمم تو یہ بات ہے۔۔۔

جی اور آپکو پتا ہے چودہ اگست بھی آنے والی ہے اور وہ بھی میری پہلی جشن آزادی ہے۔۔وہ اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔۔

جشن آزادی کا دن تھا بی جان کے گھر میں سب آ گئے تھے رمشہ کچھ خاموش سی تھی پر ہر کام میں بھر چڑ کے حصہ لے رہی تھی اور ساتھ اپنے ماما بابا کو بھی یاد کر رہی تھی گھر پورا جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا وہ اپرا کیلی چھت بیٹھی ہوئی تھی کے پیچھے سے اسے کسی کی حرکت سی محسوس ہوئی جب اس نے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گئی بابا ماما کو دیکھ کر بابا آپ۔۔۔کیوں میں نہیں آ سکتا یہ وطن بس تمہارا ہمارا نہیں ہے کیا ۔۔۔رمشہ منہ بنا کر بولی کچھ لوگوں کو پاکستان پسند نہیں تھا اور اب اتنا نخرہ۔۔۔

انسان کہیں بھی چلا جاتا پر سکون اپنی جگہ ملتا ہے اپنے وطن میں ملتا ہے

جی بابا۔۔۔وہ تینوں نیچے اتر گئے اور عبداللہ نے عہد کیا کہ اب وہ اپنے وطن میں ہی رہے گا جیسا بھی ہے پر اپنا دیس ہے۔۔۔

یہ میرے دوست کی کہانی ہے۔۔۔

رخسانہ افضل

شادی والا گھر ہے، دلہے سے نکاح نامہ پر کرنے کے لئے والد کا نام پوچھا جا رہا ہے، مگر دلہا خاموش۔۔وہاں موجود تمام لوگ دلہے کے والد کے نام سے بے خبر تھے۔۔سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔۔دولہا اندر اپنی والدہ کے پاس گیا۔۔اماں ابا کا نام کیا تھا؟

ماں خاموش بیٹے کو تکنے لگی!!

ماں بولتی کیوں نہیں؟ بیٹے نے پوچھا۔۔پڑوسن بولی۔۔نسرین کچھ تو بول۔۔بیٹا جیسے ایک دم کس نتیجے پہ پہنچا!!!

ماں میں کون ہوں ۔۔کیا میرا باپ کوئ نہیں ، مجھے پیدا ہوتے ہی مر دیتی ماں ۔۔آج یہ ذلت بھرا دن تو نا دیکھنا پڑتا مجھے ۔۔ بیٹا بکتا جھکتا باہر جانے لگا کہ ماں بولی ۔۔بیٹا میری بات سن کے جا ۔۔

میں اپنے بابا کی لاڈلی ۔۔ماں کی سوہنی دھی ۔۔ ہندوستان میں رہتے تھے ، ہندو جینے نا دیتے ۔۔فسادات پھوٹ پڑے ۔۔ماں ماردی بلوائیوں نے ۔۔باپ مجھے لے کے رات کے اندھیرے میں نکلا ، دن میں چھپتے ، رات میں سفر کرتے ۔۔کسی طرح ریلوے اسٹیشن پونچ گئے ۔۔چلتی ٹرین میں بلواء کود پڑے ۔۔بابا نا بچ سکے ۔۔میں بچ گ ۓ ۔۔اچانک لاشوں کے ڈھیر سے بچے کے رونے کی آواز آۓ ۔۔میں نے اگے بڑھ کے تمھیں گود لیا اور پاکستان اگ ۓ ۔۔بتاو کس سے پوچھوں تیرے باپ کا نام ۔۔بیٹا ماں کے قدموں میں گر گیا ۔۔تمام لوگ اشکبار تھے ۔۔۔

اور میں سوچ رہی تھی ک ہم آج کیا کر رہے ہیں ۔۔ 14 اگست کیسے مناتے ہیں ۔۔ one wheeling کر کے ، ریس لگا کے ۔۔گرین کپڑے پہن کے ۔۔کیا پاکستانی ہونے کا حق ادا کر دیا ہم نے

آزادی ہند و پاک

ابوعفان عارف

آج صبح اٹھتے ہی سارہ نے بچوں کو جلد تیار کر دیا ہے ۔انھیں اسکول بھیج وہ بہت تیزی سے ہاتھ میں دس سال پرانا اخبار لئے پولیس اسٹیشن جا رہی ہے ۔اس کے گمشدہ والد کی آج دس سال بعد بھی کوی ٔخبر نہیں ہے ۔مگر اس کا دل آج بھی کہتا ہے کہ اس کے والد زندہ ہیں ۔دس سال پہلے وہ اپنے دوست سے ملنے ہندوستان جا رہے تھے ۔

آج ان کے گھر سے آ رہی بہترین پکوانوں کی خوشبو نے سارا محلّہ مہکا رکھا ہے ۔زعفرانی زردے کی خوشبو اپنے آپ میں ایسے ہی ہے جیسے پکار کر بتا رہی ہو کہ آج پھر حیدر علی صاحب کی سالگرہ ہے ۔ہر سال ان بزرگ وار کی سالگرہ پر اس گھر کا معمول ہے کہ مہمان نہیں بلاے جاتے ۔سجاوٹ نہیں ہوتی ۔مگر ان کی سالگرہ کے دن اس گھر میں چاول کا زعفرانی زردہ ضرور بنتا ہے ۔یہ وہ خاص موقع ہے جس دن حیدر علی صاحب زندگی کی بہاریں مکمل کر رہے ہیں ۔بہترین شخصیت مسکراتا چہرہ سفید داڑھی اجلی رنگت ۔اس عمر میں بھی بینائی ٔ اور فہم ایسی کہ اطراف کے گھروں کے بچے ہوں یا جوان سب ان کی صحت و تندرستی دیکھ کر حیران رہتے ہیں ۔وہ ہر صبح ایک پرانی سی کتاب لے کر پڑھتے رہتے ہیں ۔شاید اسی وجہ سے سب انھیں کتاب چاچا کہتے ہیں ۔

آج ان کی سالگرہ ہے ۔سورج اب ڈھلنے کو ہے ۔مگر کتاب چاچا نظر نہیں آ رہے ۔ان کا پوتا بار بار اپنے والد سے ایک ہی بات کہہ رہا ہے ۔

ابو ۔۔ !!دادا جان کہاں ہے مجھے بھوک لگی ہے ۔

اور اس کے والد مسکرا کر اسے دلاسہ دے رہے ہیں ۔بیٹا دادا جان اپنے دوست کو لینے ریلوے اسٹیشن کے پاس گیے ہیں ۔اب آتے ہی ہونگے ۔

آج پھر پچھلے دس سالوں کی طرح یہ بزرگ ریلوے اسٹیشن کے سامنے والی پرانی آٹے کی چکی کے پاس انتظار کر رہے ہیں ۔پر اب شام

ہو چکی انھیں یقین ہو چلا ہے کہ شاید اس سال بھی ان کا دوست ان سے ملنے کا وعدہ پورا نہیں کر سکا۔

مگر وہ مایوس نہیں ہے۔انھیں یقین ہے کہ ایک دن ان کا دوست اپنا وعدہ پورا کرے گا۔سرحدوں کے پار کبھی وہ ان سے ملنے ضرور آئے گا۔بچپن کی اپنی سنہری یادوں کو ذہن میں دہراتے۔دل ہی دل مسکراتے وہ اپنے گھر واپس لوٹ آئے ہیں۔

آج بھی تنہا ہی لوٹے ابا جی۔بہو نے مایوسی اور طنز کا ملا جلا فقرہ ان کو دیکھ کر کہہ دیا۔

دادا جان کہاں گیے تھے آپ۔؟؟

آپ کے دوست کون ہیں۔ ۔؟؟؟وہ کہاں رہتے ہیں۔؟؟

معصوم کے سوالات پر وہ مسکرا دیئے۔لیکن آج شاید وہ اس سوال کا جواب دینا چاہتے ہیں۔کہتے ہیں۔بیٹے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔پھر آج آپ کو اپنے دوست اور اپنی کہانی سنایں گے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر آج پوتے نے دادا جان کے کمرے میں ڈیرہ ڈال دیا۔کہتا ہے آج کہانی سن کر رہے گا۔آخر اس کے دادا جان نے اپنے ماضی سے ایک خط نکال کر اسے سنانے کا فیصلہ کیا۔

یہ خط میرے دوست کا ہے جو گیارہ سال پہلے پاکستان سے اس نے مجھے لکھا تھا۔جانتے ہو بیٹے وہ ایک بہت اچھے پروفیسر و مصنف ہیں۔

دادا جان پاکستان۔۔؟؟

آپ پاکستانی ہو۔۔۔؟؟

نہیں بیٹے۔۔وہ مسکرا کر بولے

تو پھر آپ کے دوست پاکستان میں کیوں ہے۔؟؟؟

بیٹے۔۔ !!!!ہم دونوں دوستوں کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی یہ ہے۔کہ ہم جب سے ملے تب سے اب تک ہم پڑوسی رہے ہیں۔

ان کا یہ خط سنو تمہیں سب سمجھ آجائے گا۔

اللہ تبارک وتعالی کا فضل وکرم اور احسان ہے کہ ہم یہاں خیر وعافیت سے ہیں۔رب کعبہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اس گنہگار کو اس خط کی کتابت کا موقع دیا۔میرے عزیز یہ خط نہیں۔آپ کے اس بھائی کے جزبات ومحبت کی روشنائی سے رقم داستانِ اخوت ہے۔جو عرض فریاد کرتی ہے اپنے عزیز وہمنوا کے حضور۔آپ کا ہمجولی اپنی عمر کے اس آخری پڑاو پر آپ کی ایک نظرِ کرم وملاقات کا شدت قلب سے منتظر ہے۔

آج دورانِ حج آپ کے چچازاد بھائی سے مکہ میں ملاقات ہوئی۔ملاقات کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ تقریبا دس دن سے ہیں مگر پہچاننے کا شعور آج بیدار ہوا۔جب ایک پاکستانی اور ایک ہندوستانی کے بیچ آزادی ہند اور تقسیم ملک پر بحث ہو گئی۔یہ بحث تلخ ہونے کو تھی کہ ہم دونوں کو پتہ چلا کہ ہم زمانے طفیلی کے پڑوسی ہیں۔واللہ کہتا ہوں اچانک سب کچھ ہم دونوں بھول گیے۔نہ ملک وسرحد یاد رہی نا چند لمحے پہلے کی تلخی۔اس وقت دل وذہن میں سب سے اول جو نام آیا وہ آپ کا تھا۔کہ وہ میرا ہمجولی میرا ساتھی حیدر علی کہاں

ہے۔سنا ہے رب کریم نے آپ کو مال واولاد سے بہت نوازا ہے۔اللہ تعالی مزید برکت عطافرمائے۔آمین۔

مجھے یاد ہے بچپن میں بھی تم اپنے والد کی طرح ایک کامیاب تاجر بننا چاہتے تھے۔بچوں کو شرارت کرتے جب دیکھتا ہوں تو مجھے اکثر ہمارا بچپن یاد آجاتا ہے۔ہم سلیمان حلوائی کی دکان پر مٹھائیاں لینے جاتے اور چپکے چپکے اس کی زردے کی پرات سے زردہ اٹھا کر کھایا کرتے تھے۔ایک دن اس نے دیکھ لیا اور خوب ڈانٹا تھا۔اس دن تم نے کہا تھا دیکھنا تابش جب ہم بڑے ہوجایں گے نا۔۔۔ !!!!!

تو یہ زردے اور حلوے روز پکیں گے میرے گھر۔اس وقت ہم دونوں بچے تھے۔پھر وہ دن بھی یاد آتے ہیں جب قیام پاکستان ہوا۔ہم دونوں جو ایک دوسرے کے ساتھ سائے کی طرح رہتے تھے۔وقت وحالات ایسے ہوے کہ دو مختلف ملکوں کے شہری ہوگیے۔مجھے یاد ہے تم مولانا آزاد کے بہت بڑے مداح تھے۔وہ کہتے تھے کہ قیامِ پاکستان کے بعد دونوں طرف کے مسلمان ادھورے ہوجایں گے۔ایک طرف نیا ملک ہوگا۔جہاں آزادی تو ہوگی مگر قلت وسائل اور اقتصادی کمزوری بھی ہوگی۔دوسری طرف کے مسلمان اقتصادی طور پر مضبوط ہونگے مگر حقوق میں نادار ہونگے۔ایک رہنما محمد علی جناح تھے۔جو مسلمانوں کی زمین اور مسلمانوں کی ترقی وآزادی کا درس دیتے تھے۔ایک ایسے ملک کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے جو اسلام کا قلع بنے اور مسلمان عزت ووقار کے ساتھ وہاں رہ سکیں۔آج الحمدللہ ہمارا ملک قائداعظم کے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہے۔میں آج بھی ان کی رہبری کا قائل ہوں۔لکھنے کا شوق تو تھا۔عمر کے ساتھ ساتھ شعور بھی رب کریم نے عطا کردیا۔اب کالج میں بچوں کو پڑھاتا ہوں۔اپنی زندگی میں کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں۔جو آج کی نوجوان نسل کو جنگِ آزادی میں دی گیءبے شمار قربانیاں یاد دلاتی رہی ہیں اور قیامِ پاکستان کا مقصد سمجھاتی رہی ہیں۔اس خط کے ساتھ ایک کتاب بطور تحفہ آپ کے لیے بھیج رہا ہوں۔انشااللہ آپ کی اگلی سالگرہ پر آپ کے گھر تشریف لاں گا۔سنا ہے آپ اپنے گھر میں آج بھی زردہ بہت شوق سے بنواتے ہیں۔دونوں ساتھ بیٹھ کر کھایں گے۔وہیں ملیں گے ہم ہمیشہ کی طرح اسٹیشن کے سامنے والی چکی کے پاس۔۔۔

آپ کا دوست آپ کی دعاوں کا طالب   تابش مسعود

خط پڑھتے پڑھتے بزرگ کے چہرے پر جزبات کی لکیریں سرحدوں کے تار کی طرح امڈ پڑی تھی۔پوتا سنتے سنتے ہی شاید نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ایسا اس لیے بھی تھا کہ پندرہ برس پہلے ایک فرقہ وارانہ فساد میں انھوں نے اپنا ایک جوان فرزند کھویا تھا۔کہیں اپنے دوست کا خط ان کو اپنے ماضی میں لے گیا تھا۔وہ سوچ رہے تھے کاش ان کے والد بھی اس وقت پاکستان ہجرت کر جاتے تو اچھا ہوتا۔ان کا بیٹا بھری جوانی میں ان کی آنکھوں کے سامنے قبر میں نہ اتارا جاتا۔

ٹرین سے اترا یہ نوجوان اجنبی سا لگ رہا تھا۔شاید پہلی دفعہ اس شہر میں آیا تھا۔دیہاتی پہناوا گھبرایا ہوا سا چہرہ۔ہاتھوں میں گٹھری لیے بہت تیزی سے اسٹیشن سے باہر جا رہا ہے۔ایک بوڑھا شخص اسے پیچھے سے پکار رہا تھا۔او بیٹے۔۔ !!!!! تیرا بیگ پیچھے رہ گیا۔نوجوان نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔

یہ بزرگ بیچارے اس بیگ کو دیکھ رہے تھے اور شاید ان کو شک تھا کہ وہ نوجوان کوی ءدہشت گرد تھا۔ابھی وہ آگے بڑھ کر کسی کو اطلاع

کرنے کی سوچ رہے تھے کہ ایک دھماکہ ہوا۔ چاروں طرف لاشیں بچھ گی ء۔ ان سب میں وہ بزرگ کہیں کھو گیے ۔ ان کا تو وجود ہی جیسے فضا میں بارود کے ساتھ گھل چکا تھا۔ لاشوں کی شناخت ہوی ء۔ کی ءلوگ آج تک لا پتہ ہیں ۔ کہتے ہیں پاکستان میں ہوے اس دھماکے کے بعد جو لوگ لا پتہ ہوئے ان میں پروفیسر تابش مسعود بھی شامل ہیں ۔ کچھ لوگ دعوہ کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ دھماکہ کیا تھا۔ اپنے ملک کے مظلوم مسلمان بھائیوں کے حقوق دلانا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے۔

دھرتی کا رکھوالا

آصف سانول جوئیہ (بہاولنگر لائیو دبئ)

فراز ایک متوسط گھرانے کا لڑکا تھا اسکے والد پاک آرمی سے ریٹائر ہو چکے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ اسکا بیٹا بھی وطن کی حفاظت کرے

آخر چھے ماہ تک فراز کراچی ٹریننگ کرتا رہا اور پھر پاک آرمی میں بھرتی ہو گیا

اسکی ڈیوٹی بہاولنگر سے 13 کلومیٹر دور بارڈر پہ بھاون شاہ چوکی پہ لگی

فراز کو چوکی سے ایک کلومیٹر دور او پی پہ دشمن کی حرکات وسکنات کا خبر رکھنے پہ مامور کیا گیا

قارئین او پی کی ڈیوٹی فوج کی سب سے مشکل ترین ڈیوٹی ہوتی ہے وہاں دن رات اکیلے ہی چوکیدار کی طرح بارڈر کی زیرو لائن پہ نظر رکھنی پڑتی ہے

فراز زمہ داری سے اپنی ڈیوٹی کرنے لگا کپاس کا موسم تھا اور بارڈر کے دونوں طرف کپاس تھی

ہندوستان کی دو ایکڑ زرعی زمین بارڈر کی تار کے ساتھ ساتھ ہماری طرف ہے جہاں پر سکھ اپنی فصل کاشت کرتے ہیں

یعنی انڈیا نے پاک فوج کے ڈر سے زیرو لائن سے دو ایکڑ پیچھے ہی تار لگائی ہے کہ اگر پاک آرمی ہماری طرف بڑھیں بھی تو دو ایکڑ کراس کرنے تک ہم کو خبر ہو جائے گی

کپاس کی چنائی شروع تھی اور ادھر پاکستانی عورتیں کپاس کی چنائی کر رہی تھیں ادھر زیرو لائن کے پاس تار سے ہماری طرف سکھ عورتیں کپاس کی چنائی کر رہی تھیں سکھ عورتوں کے ساتھ دو چار سکھ مرد بھی تھے جب کہ پاکستانی عورتوں کیساتھ کوئی مرد نہیں ہوتا تھا

سکھ عورتیں جب کپاس کی چنائی کرتیں انکا ایک فوجی بارڈر کی تار کے پاس بیٹھ جاتا

تھوڑے دن گزرے تھے کہ ایک سکھ نے ایک مسلم لڑکی سے مراسم اختیار کر لئے

کیوں کہ دس پندرہ قدم کے فاصلے پہ ہوتے ہیں آنکھوں کے اشارے بھی نظر آتے تھے

سکھ مسلم لڑکی کو کہتا کہ تم اس طرف آو اور مسلم لڑکی سکھ کو کہتی تم ادھر آو آخر سکھ منہ کے بل لیٹ کر زیرو لائن کراس کر کے پاکستانی حدود میں داخل ہو گیا اور قریبی کپاس میں چھپ گیا مسلم لڑکی پہلے سے وہاں موجود تھی دس پندرہ منٹ کے بعد جب سکھ منہ کے بل لیٹ کے واپس جانے لگا تو فراز نے دیکھ لیا

کیوں فراز کی او پی اس جگہ سے کوئی پچاس ساٹھ قدم پہ تھی

فراز کی نظر سامنے بارڈر پہ تھی جبکہ سکھ عقبی سائیڈ سے پاکستانی حدود میں داخل ہوا تھا

جب فراز کی نظر پڑی تب تک سکھ زیرولائن کراس کر کے ہندوستان کی حدود میں داخل ہو چکا تھا اور اپنی کپاس میں چھپ چکا تھا

فراز کا خون جوش مارنے لگا اسکی غیرت اسے اتنا ملامت کر رہی تھی کہ اسکے ہوتے ہوئے ایک سکھ مسلم لڑکی سے مل کے جا چکا تھا

شام ہوگئی چھاونی سے اسکا کھانا آیا اور اس نے ویسے ہی رکھ دیا اسکے لئے روٹی حرام ہو چکی تھی

وہ اک پل کو آنکھیں بند کرتا تو جاتے سکھ کی کمر اسکی نظروں کے سامنے آجاتی ساری رات اس نے کانٹوں پہ گزاری

اسے ایک پنجابی کی کہاوت یاد آئی

دادا کہتے تھے بیٹا جو گھوڑی ایک بار دانے کھا جائے وہ دوسری بار ضرور اس جگہ پہ آتی ہے کہ شاید اس بار پھر دانے ہوں

بس دادا کی یہ کہاوت فراز کے دماغ میں بیٹھ چکی تھی اور اسکا من کچھ ہلکا سا ہونے لگا تھا

اس نے اسٹین گن کا رخ بارڈر سے بدل عقبی سائیڈ جہاں سے سکھ پاکستانی حدود میں داخل ہوا تھا اس طرف کر دیا اور گھات لگا کے بیٹھ گیا

دوسرے دن وہ سکھ اور انکی عورتیں بارڈر سے پار ہماری طرف داخل ہوئے اور اپنی کپاس کی چنائی کرنے لگے جب اس طرف مسلم

عورتیں بھی زیرولائن کے پاس کپاس کی چنائی کر رہی تھیں اسے پکا یقین ہو گیا کہ آج پھر وہ ملیں گے اور وہ اپنے وطن کی عزت کی خاطر

دونوں کا خون کرے گا مگر شاید ان دونوں کی زندگی میں سے ایک دن باقی تھا

کیونکہ اس دن کرنل صاحب نے بارڈر پہ واقع چوکیوں کا دورہ کیا تھا اور دو منٹ بعد زیرولائن کی سڑکوں پہ پاک آرمی کی گاڑیاں گشت کر رہی تھی

دوسرے دن بارڈر پہ امن تھا اور سکھ بھی آچکا تھا اور مسلم عورتیں بھی

فراز کی چور نظریں اسی جگہ پہ تھیں جہاں سے سکھ آیا تھا آخر فراز کے دادا کی کہاوت سچ ثابت ہوئی

گھوڑی دوبارہ دانے کھانے آئی تھی اسٹین گن کا رخ پہلے سے اس طرف تھا

جب سکھ منہ کے بل لیٹ کر زیرولائن کراس کر آیا اور اس مسلم لڑکی کے پاس پہنچ گیا تو فراز نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور برسٹ مار دیا

اک پل میں اس نے چالیس گولیوں کا برسٹ نکال دیا تھا سکھ اور لڑکی دونوں ہلاک ہو چکے تھے جبکہ فائرنگ کی آواز سے انڈین آرمی

نے بھی فائر کھول دیا تھا سب عورتیں کپاس میں لمبی ہوگئی

وائرلیس ہر طرف چل گئی کہ بھاون شاہ چوکی پر کشیدگی ہوگ ء ہے پاک آرمی بھی حرکت میں آگئی اور جوابی فائرنگ دس پندرہ منٹ بعد

فائرنگ بند ہوگئی پاک آرمی کے فوجی دستے جائے وقوعہ پہ پہنچ گئے

جب موقع دیکھا تو ایک سکھ اور مسلم لڑکی پاکستانی حدود میں پاس پاس پڑے تھے

فراز کو بلایا گیا فراز نے دو دن پہلے سے لے کر اب تک بیان درج کروایا

فراز کو اعلی افسران کے سامنے پیش کیا گیا جہاں اسے مزید ترقی دے کر میجر بنا دیا گیا اور ٹرانسفر وزیرستان میں کر دیا

فراز بہت خوش تھا اس نے پاک دھرتی کی لاج رکھی تھی

وزیرستان میں ہنگو کے مقام پہ دہشت گردوں سے مقابلہ ہوگیا اور فراز سینے میں گولی لگنے سے جام شہادت نوش کرگیا مگر وطن سے محبت ظاہر کرگیا

تم سے ہے پاکستان

لبنیٰ غزل (کراچی)

"ہمیشہ کی طرح اسکول میں جشن آزادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔اور وہ اس سال کا جشن آزادی اس شایان شان طریقے سے منانا چاہتی تھیں کہ مدتوں یاد رکھا جائے۔۔کیونکہ بحثیت پرنسپل ان کا اس اسکول میں یہ آخری سال تھا۔

جشن آزادی کی تیاریوں کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے آٹھویں کلاس سے لے کر دسویں جماعت تک کے طلبا کو اسکول کے ہال میں بلالیا۔۔آج وہ ان سے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔عید آزادی کا پیغام دینا تھا اس نئی نسل کو۔

"بچو۔۔آج آپ جشن آزادی کی تیاریوں میں جس جوش وجذبے کے ساتھ حصہ لے رہے ہو،اس وطن کو سنوارنے کے لئے بھی اسی جذبے کی ضرورت ہے۔۔یہ ملک جس میں ہم آزادی کے ساتھ سانس لے رہے ہیں۔یہ طشتری میں رکھی ہوئی نہیں ملی۔اس کے لئے ہمارے بزرگوں نے جان ومال اور عزت کی قربانیاں دی ہیں۔میری والدہ نے بتایا تھا کہ وہ سب کس طرح اپنا سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ کر پاکستان کے قافلے میں شامل ہوئے تو راستے میں کتنے ہی بچے،جوان،بوڑھے اور عورتیں سکھوں اور ہندوں کے ظلم کا نشانہ بنے۔ہم ان خوش نصیب خاندانوں میں سے تھے جو آگ اور خون کے میدان پار کرکے،اپنی جان پر کھیل کر،خونی ہجرت کرکے پاکستان کے کیمپوں میں پناہ گزین ہوئے۔

انگریزوں کی چالاکی اور ہندوں کی سازش اور ہماری بدقسمتی سے وہ کچھ ہمارے حصے میں نہ آیا جو ہمارا حق تھا۔مگر پھر بھی ہماری لٹی پٹی،ٹوٹی پھوٹی قوم کے جذبے سلامت تھے۔اور ترقی کرنے کا عزم زندہ تھا۔مگر بدقسمتی ساتھ رہی کہ قائداعظم اور لیاقت علی خان کے بعد کوئی مخلص رہنما نہ مل سکا۔ہماری قوم وہ ترقی کر ہی نہ سکی جو ہمیں درکار تھی۔مگر پھر بھی وہ دور آج کے دور سے بہت بہتر تھا۔اچھا اور سستا زمانہ تھا۔صاف ستھرا آلودگی سے پاک ماحول تھا۔سڑکیں روز دھلتی تھیں۔درختوں سے ٹھنڈی ہواں کے ساتھ ساتھ صاف آکسیجن،سانسوں کا ایندھن بنتی تھی۔تھوڑی بہت ترقی کے ساتھ قوم کو آگے بڑھنے کی امید تھی۔مگر ملک کی آبادی بڑھنے لگی تو وسائل کم اور مسائل بڑھنے لگے اور پھر خلوص سے عاری مفاد پرست سیاست دانوں کے ہاتھ ملک آگیا تو اندرونی خلفشار اور بیرونی سازشیں بڑھنے لگیں۔ظاہر ہے جب اپنے گھر کی دیواریں کمزور پڑنے لگیں اور گھر کی حفاظت کرنے والے لاپرواہ ہوجائیں تو دوسروں کو گھر میں گھسنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ہماری سیاست دانوں کی غلط حکمت عملی اور خودغرضیوں کے باعث ہم پر جنگیں مسلط ہوئیں۔ 1965 کی جنگ تو فوج کی بہادری اور عوام کے جذبے سے جیتی گئی مگر 1971 کی جنگ دشمن یعنی بھارت کی سازشوں کی حکمت عملی تھی جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوگیا۔۔ملک ایک بار پھر سالوں پیچھے چلا گیا۔۔پھر اس ٹوٹے پاکستان کو عوام کے نمائندوں

نے سنبھالا دیا۔اور تقسیم ہوا،ٹوٹا پاکستان اپنے پاں پر کھڑا ہونے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔صرف چند سالوں میں اس کمزور پاکستان نے سر اٹھایا اور دنیا کے سامنے اپنی مثال اور اسلامی اتحاد قائم کرنا چاہا،مگر یہ اتحاد دنیا کے نام نہاد ناخداں کو گوارہ نہ تھا۔اور ایک بار پھر اس ابھرتے ہوئے پاکستان کو کمزور کر دیا گیا۔۔اس سے عوامی طاقت چھین لی گئی اور اسے اندرونی انتشار کے حوالے کر دیا گیا۔۔جب سے اب تک یہ وطن ناقدرے سیاستدانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے۔اور اس کی کمزوریوں پر دہشت گردی،آلودگی،رشوت ستانی،بدعنوانی اور سفارشی ہتھکنڈوں نے حاوی ہو کر اسے کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔۔اور جب حکومتی ادارے عوام کی فلاح و بہبود کی بجائے اپنے ایوانوں اور محلوں کو سجانے لگ جائیں تو اس ملک پر دنیا کی غاصب طاقتیں،اپنی چمگادڑ جیسی نظریں جمائے رکھتی ہیں۔مگر یہ ملک اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور ان شا اللہ رہے گا۔اس ملک کی روشن امید اور اس کا مظبوط سہارا اب آپ لوگوں کے دم سے ہے۔آپ مستقبل کے معمار ہو۔یہ وطن امانت ہے اور آپ امین ہو اس کے۔ایک روشن اور سرسبز ہا کستان آپ کا منتظر ہے۔آگے بڑھو نونہالو۔۔! کہ تم سے ہے پاکستان۔۔اس عید آزادی کو ایک دن کی عید نہ بنا۔ہر دن عید کی طرح ہو اور اسے سرسبز جھنڈیوں سے ہی نہیں،اصل میں سرسبز اور شاداب کر دو۔اس کی خشک سالی کو خوشحالی میں بدل دو۔۔آ۔۔میرا ساتھ دو پاکستان کا ساتھ دو۔اور کل سب بچے ایک ایک ہودا لگا کر سرسبز ہا کستان کی بنیاد رکھیں۔"پرنسپل صاحبہ کی طویل جذباتی تقریر اور پاکستان کی اس کہانی نے سب کو آب دیدہ کر دیا۔۔سب کی آنکھوں میں اک عہد تھا۔

اور اگلی روشن صبح آزادی میں سب نے دیکھا۔۔وہ ننھے بچے اپنے ننھے ہاتھوں سے اسکول کے اطراف میں جگہ جگہ پودے لگا کر ایک سرسبز روشن پاکستان کی بنیاد رکھ رہے تھے۔۔۔یہ تھے پاکستان کی روشن امید اور سہارا اور مستقبل کے معمار۔جن کے عزم و حوصلے کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

آزادی

صفی نیاز

گلناز کا بچپن بہت ھی رنگین تھا مگر مستقبل اتنا ھی تاریک کسے خبر تھی یہ نازک سی تتلی مشقتوں کی چکی میں پسے گی۔جس گھرانے میں یہ کلی چٹخی وہاں کی ریت تھی سن بلوغت میں ھی بیاہ دیا جائے اس کے والدین کا شمار دہلی کے امرا میں تھا

16 سال کی گلناز دلہن بن کر اور بھی سندر دکھائی دے رہی تھی۔

کہ جیسے کوئی پری وش کہ جیسے فردوس بریں کی حور کا عکس۔۔۔۔

اور شوہر سانولی رنگت کا سادہ سی طبیعت کا مالک تھا۔جس کا نام حبیب تھا۔

خیر۔۔شادی دھوم دھام سے پایہ تکمیل کو پہنچی۔

گلناز کا سسرال صرف تین افراد پہ مشتمل تھا رئیس باپ نے بیٹی کے لئے سسرال بھی نوابی ڈھونڈا۔

خوب گزر رہی تھی عمر رواں خوشحالیوں کا زینہ طے کرتے ہوئے فلک بوس بلندیوں پہ تسکن افروز تھی۔

کہ یک لخت وقت نے کروٹ لی حالات کا مزاج بدلہ۔۔۔دہلی میں ھندوراج پیر جمائے ہوئے تھا انگریز حکومت کی اجارہ داری

کیسے برداشت کرتے وہ کہ ان کے شرک وبدعت کورد کرتے ہوئے کوئی قران کھولے کوئی رب کے حضور سر جھکائے۔

گلناز کے والدین اور سسرال کا یہی شغل اہل محلّہ اور حکمرانوں کی نظر میں خٹک رھا تھا۔

یونہی آزادی کا نقارہ بجا ایک اودھم سا مچ گیا۔قتل وغارت عام ہوئی۔

اللہ کے دربار میں جھکنے والی گردنیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر کاٹی جانے لگی۔

شر پسندوں نے گلناز کے والدین کو نشانہ بنایا لاکھوں مسلم ابدی نیند سلا دیئے گئے گلناز کے ماں باپ اور بہن بھائی بھی اپنے دین کی

حرمت پہ قربان ہوئے۔

ایدھر انگریز فوج حبیب کا گھر حراست میں لیئے ہوئے تھی۔

ساس سسر، بہو بیٹے کی جان بچانے میں محو اور بہو بیٹا ان پہ قربان ہونے کو تیار۔۔۔

اسی اثنا ایک وحشی نے گولیوں کی بارش

برسادی حبیب اور اس کے ماں باپ وہیں ڈھیر ہوئے۔

بدنصیب گلناز۔۔کوئی ایک گولی بھی چھو نہ سکی،شاید کہ اس کے نصیب میں کچھ رسوائیاں باقی تھیں۔

بیھوشی کا سکتہ ٹوٹا تو گلناز نے خود کو ایک کٹیا میں پایہ۔

پاس بیٹھا ایک ادھیڑ عمر بزرگ کانپتے ھاتھوں میں مٹی کا پیالہ لئے گلناز کے منہ پہ پانی کے چھینٹے مار رھا تھا اور زاروقطار رو رھا تھا۔۔

ھوش آتے ھی گلناز چیخ اٹھی۔گزرا ھوا سارا واقعہ نظر میں قید رھا جو آنسوؤں کی لڑی باندھ گیا۔

اس عمر رسیدہ شخص کا نام قاضی تھا جو اپنے عزیز واقارب اسلام کے تقدس پہ قربان کر چکا تھا یہ تو مسلم تھا۔یہ سچ ھے وقت گھاو دیتا ھے تو

مرھم بھی وقت ھی ھے۔

دونوں باپ بیٹی کے رشتے میں بندھ گئے۔

گلناز کپڑے سی کر اپنا اور اپنے منہ بولے بسپ کا گزارہ چلا رھی تھی بیشک پیٹ کا دوزخ ٹھنڈا کرنا بھی تو ضروری تھا نا۔

دن بھر مشین چلاتی اور رات رات بھر مصلے پہ سر جھکائے بلکیں بھگوتی ٹوٹتی رات کی اوڑھنی اوڑھ کر خوب روتی،اک وھی تو خامشیاں سننے

والا ھے اسی کی رحمتیں ڈھارس تھیں۔ایک شب سکوت رات

محو دعا تھی کہ باپ کے کھانسی مخل ہوئی۔

گلناز دوڑ کر باپ کی چارپائی سے آ لپٹی۔۔۔۔بابا۔۔بابا۔۔بابا

پانی لاوں۔۔بابا پانی لاوں۔،؟

قاضی نے گلناز کا ہاتھ اپنے کانپتے ھاتھوں میں بھر لیا۔

پھولی ھوئی سانس سے بامشکل ایک جملہ مکمل کر پا یہ۔۔۔۔گل ن از۔۔۔

قافلے پاکستان جا رھے ھیں کئی چلے گئے اور کئی ابھی جائیں گے۔بیٹا تم صبح منہ اندھیرے ھی نکل جانا۔۔وہ اپنی بوسیدہ جیکٹ کو ٹٹولتے ھوئے بولا۔۔اس کی جیب میں پرچی ھے

خاور کے نام۔۔۔ٹھیک تیں گھر جھوڑ کے جو ھے نا!!!

بیٹا یہ پرچی لو اور نکل جاو انکا ٹبر روانہ ھونے ھی والا ھے۔۔۔جاو دیر نہ کرو جاو۔۔جاو بیٹا جاو۔۔۔

گلناز کی ھچکیاں بندھ گئیں۔

نئیں بابا نئیں میں آپ کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاوں گی۔۔

میں نہیں جاوں گی۔۔۔،،،بابا آپ بھی۔۔۔۔۔

گلناز جملہ مکمل نہ کر پائی،قاضی کی روح پرواز کر گئی۔

اپنے گلے میں اپنی بانہیں ڈالے بین کرتی گلناز سوچ میں گم تھی،،،آخر کرے تو کیا کرے۔۔؟

ذھن تھا کہ جیسے حواس کھو بیٹھا ھو۔

بار بار بابا کا جملہ کانوں میں گونج رھا تھا۔۔۔سو مقدر کو کوستی گرتی پڑتی

جانے کا ارادہ باندھے اپنا ضروری سامان سمیٹنے لگی۔

بھاری بھر کم سلائی مشین بھی بامشکل اٹھاتے ھوئے خاور کے گھر کا رخ کیا ابھی چند قدم ھی لئے تھے کہ سامنے سے خاور آتا دیکھائی دیا۔

گلناز سے مخاطب ھوتے ھوئے بولا دھی اے توں چل تے میں خاور نوں سلام کر کے آیا۔۔

خاور کے یہ الفاظ گلناز کا صبر و ضبط نگل گئے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بابا۔۔۔بابا۔۔۔بڑبڑاتے ھوئے

طلاطم خیز ندیاں پھوٹ پڑی۔خاور چاچا۔۔چاچا

بابا۔۔۔۔۔بابا۔۔۔نہیں رھے نہیں رھے۔۔۔بابا

۔۔۔مجھے چھوڑ گئے تنہا چھوڑ گئے۔۔۔مجھے۔

خاور کہ جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ھو۔روتے ھوئے قاضی کے گھر کی طرف دوڑا

گلناز بھی ساما پھینک واپس پلٹ آئی۔۔۔

دونوں،،،قاضی کی میت پہ نظریں گاڑے زار و قطار روئے جا رھے تھے۔

اچانک دروازے پہ دستک نے چونکا دیا۔ک ک کون۔۔۔کون ھے در پہ۔۔۔؟

باھر سے آواز آئی۔ابا اتھے آیا۔۔،،؟

دروازے پہ شروز تھا خاور کا بیٹا۔

دروازہ کھلا پایا تو اندر داخل ھوگیا

بابا چانن ھون توں پیلاں ای نکلنا سہی رھے گا، چلیئے،،۔؟

چاچا قاضی جلدی کرو۔۔۔آپ بھی

چاچا آوی جا۔۔۔۔۔۔۔گلناز روتے ھوئے

ویرے۔چاچا سانوں چھڈ گیا۔۔۔گلناز روتے ھوئے

ویرے۔چاچا سانوں چھڈ گیا

روتے روتے خاور کے گلے جا لگی۔

چپ کر دھی اے چپ کر۔۔شروز اندر بھاگا۔۔

چاچا۔۔چاچا۔۔میت کے سر پہ سے ٹیکے خوب رویا۔۔۔

خاور گلناز کو دلاسے دینے میں محو تھا

اور شروز پلکیں بھگوئے جا رھا تھا

برتن گرنے کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔

تینوں سہم گئے ک ک کون۔۔،؟ کون ھے۔،؟

بلی دودھ کے کٹورے پہ لپکی دیکھائی دی۔

اوہ۔۔۔بلی سی۔

میری تے جان ای نکل گئی، خاور شروز سے مخاطب تھا اور گلناز بابا کا آخری دیدار کر کے اپنے رفو کئے ڈوپٹہ سے اسے ڈھانپ رھی تھی۔

خاور اب گلناز سے مخاطب ھوا

دھی اے چل ھن دیر نئیں کرنی چاھی دی۔

تینوں نے لرزتے قدموں سے خاور کے گھر تک کا فیصلہ طے کیا۔

راستے سے خاور نے گلناز کا بھاری بھرکم سامان بھی اٹھا لیا۔

باقی گھر والے باھر ہی کھڑے انتظار کر رھے تھے کہ جھٹ ساتھ ھو لئے۔کہ جلدی قافلے سے جا ملے۔

قافلہ چوری چھپے پاکستان کی طرف رواں دواں تھا۔

سفر بخیر انجام کو پہنچا۔

سرحد پار کی تو کچھ سکون کا سانس آیا۔

آزدی مبارک آزادی مبارک

کہ صدائیں گونج رہی تھیں۔وقت جیسے تیسے کٹتا گیا۔

چار سال گلناز خاور کے گھر ہی رہی۔

اسکی بیوی خالق حقیقی سے جا ملی بیٹا اپنے چھوٹے سے ٹبر کو لے کے علیحدہ ہو گیا تھا اور ایک بیٹی بیاہ دی۔

خاور تھا تو نومسلم لیکن۔۔۔ایمان خاصہ پختہ رہا۔حقیقی باپ بیٹی سا تعلق نبھا رہے تھے گلناز سلائی کرتی اور خاور بھٹے پہ ملازم تھا۔۔

ایک دن۔۔۔بھٹہ مالک جس کا نام نوید تھا گھر آیا کیونکہ خاور بیماری کے سبب کئی دن کام پہ نہ جا سکا۔

گلناز پانی کا گلاس لئے حاضر ہوئی تو نوید اپنی غلیض نظریں اس کے بدن پہ جمائے گھورنے لگا۔

اگلے دن خاور کو بھٹے پہ پا کر نوید نے فوراً اس کے گھر کا رخ کیا۔

جھوٹ کے سہارے دروازہ کھلوا لیا۔۔

دروازہ کھولو۔۔کوئی ہے

کھولو دروازہ جلدی کھولو

خاور کی طبیعت خراب ہے دروازہ کھولو۔

گلناز نے یونہی دروازہ کھولا

نوید اس کے منہ پہ ہاتھ رکھے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا۔

گلناز کی حرمت کی دھجیاں اڑا دی تقدس پامال کر ڈالا،

اپنی حوس سیراب کی پاک لہو میں اپنی غلاظت اتاری اور چلتا بنا۔

گلناز کی پرواز کرتی روح چیختی رہی۔۔

آزادی۔۔۔؟؟کیسی آزادی۔۔۔

حرمتیں تو آج بھی شیاطین کی زد میں !

تو آزادی کیسی۔؟

بچہ جمہورا

پروفیسر ملک ناصر داؤد

مداری: بچہ جمہورا۔

بچہ: بس بہت ہو گیا اب تو مجھے بچہ جمہورا کہنا بند کر دے۔ جمہوریت تو دیکھی نہیں زیادہ تر تو۔۔

مداری: آنکھیں بند کر۔

بچہ جمہورا: ستر سال ہو گئے ساری قوم کی آنکھیں بند نہیں ہیں کیا؟

مداری: جو کہتا ہوں وہ کر۔

بچہ: ہمیشہ سے سب یہی تو کر رہے ہیں۔

مداری: بک بک نہ کر۔ آنکھیں بند کر۔

بچہ: کر لیں۔

مداری: بدبخت میری نہیں اپنی آنکھیں بند کر۔

بچہ: جی حضور!

مداری: کیا دیکھ رہا ہے۔

بچہ: سبحان اللہ جسے کھلی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا اُسے بند آنکھوں سے کیا دکھائی دے گا۔

مداری: سچ سچ بول کیا دکھتا ہے؟

بچہ: سچ بولا تو یہ ڈگڈگی کا کھیل ختم سمجھو۔

مداری: بتا بابو صاحب نے کیا پہن رکھا ہے۔

بچہ: بابو ہے تو مرمت شدہ چپل پہنی ہو گی۔ (تالیاں)

مداری: بتا میں نے جس سر پر ہاتھ رکھا اُس کے بالوں کا رنگ کیا ہے؟

بچہ: کوئی بھی رنگ نہیں۔۔

مداری: بچہ جمہورا! صاف صاف بات کر۔

بچہ: تم جس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہو وہ گنجا ہی ہو سکتا ہے۔ (تالیاں)

مداری: میرے دائیں ہاتھ پر جو صاحب کھڑے ہیں۔ ان ہاتھ میں کیا ہے؟

بچہ: ہاتھ کی لکیریں (تالیاں)

مداری: میرے بائیں ہاتھ میں جو بچہ ایک ٹانگ پر کھڑا ہے اسے لوگ کیا کہتے ہیں؟

بچہ: لنگڑا (تالیاں)

مداری: نئی حکومت کیا کرلے گی؟

بچہ: وہی جو پچھلی حکومت نے کیا تھا؟

مداری: مطلب۔۔

بچہ: مطلب۔۔۔کچھ بھی نہیں۔ (تالیاں)

مداری: بابا جی کے تھیلے میں کیا ہے؟

بچہ: تھیلا خالی ہے (تالیاں)

بابا: بچے تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

بچہ: جن کے تھیلے بھرے ہوتے ہیں وہ یہ تماشہ دیکھنے کیوں آئیں گے بھلا؟؟

مداری: تماشائی اب کم آرہے ہیں۔ کیوں؟

بچہ: اب ٹی وی ہررز وسیاسی مذاکرے زیادہ ہورہے ہیں۔ وہ بھی یہی تماشے ہیں۔

مداری: مہنگائی کب کم ہوگی۔

بچہ: جب مہنگائی کا جن بوتل میں بند ہوگا (تالیاں)

مداری: ہمارا تماشہ دیکھنے تمھاری ماں کبھی نہیں آئی؟

بچہ: وہ خود تماشہ کر ہے تماش بین نہیں۔

مداری: یہ بتا ان لوگوں نے کپڑے پر کتنے روپے پھینکے ہیں؟

بچہ: ایک روپیہ بھی نہیں (تالیاں)

مداری: کیوں؟

بچہ: انہوں نے روپیہ دیکھا ہی کب ہے (تالیاں اور سکے کپڑے پر گرنے کی آواز)

مداری: بچہ جمھورا۔۔۔چل یہ بتا ان لوگوں کی قسمت کب بدلے گی۔

بچہ: جب یہ ہمارا تماشہ دیکھنا چھوڑ کر اپنا تماشہ لگائیں گے۔

مداری: ابے نمک حرام۔۔۔ہم کہاں سے کھائیں گے۔

بچہ: کوئی نیا کھیل کھیلنا پڑے گا۔

مداری: نئے کی ضرورت نہیں۔

بچہ: کیا مطلب؟

مداری: تین چار نسلوں سے یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کبھی کوئی بھوکا نہیں مرا۔

بچہ: آنکھیں کھول دوں؟

مداری: کھول دے مگر کوئی فائدہ نہیں۔۔

بچہ: کیا مطلب؟

مداری: لوڈ شیڈنگ ہے۔

بچہ: کوئی سوال کر۔

مداری: کوئی فائدہ نہیں۔

بچہ: وہ کیوں؟

مداری: تماشائی چلے گئے۔

بچہ: کتنے پیسے ہوئے؟

مداری: کل ملا کے ساڑھے بارہ روپے!

بچہ: کھیسے سے چار اٹھنیاں شامل کر۔

مداری: ارے کیا تو دیکھ رہا ہے؟

بچہ جمہورا: آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں بابا۔

چوٹ

خاور (ہری پور)

اپنے درد کو چھپانا ہی دلیری ہے، لیکن جب کوئی حادثہ ہوتا ہے ایک شخص کے ساتھ اس وقت وہ کسی ایک ایسے شخص کو بتاتا ہے، اور دکھ

سنانا چاہتا ہے، جسکی اسے پرواہ ہوتی ہے، جس کی ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے، جسکے لئے جی رہا ہوتا ہے،

لیکن اس وقت محسوس بھی کرتا ہے، اس شخص کو میری پرواہ نہیں، تو کیوں وہ اپنا مزاق بنا رہا ہے، کیوں اسکی نظروں میں گر رہا ہے،

پھر بات آجاتی ہے دل کی، یہ ساری انا اٹھا کر اس کے قدموں میں رکھ دیتا ہے،

اور پھر مایوس ہو کے ہر طرف سے،

اپنے رب سے اس چیز کا بدلہ لینے اور معافی کی امید رکھ کے خاموش ہو جاتا ہے،

پھر اس خاموشی میں جلنے کا ایک الگ مزہ محسوس ہوتا ہے،

اور ہاں اب میں خاموش ہوں،

اس خاموشی میں مجھے سکون بھی ہے کیوں کہ اس بار میں نے سب کچھ کھو دیا ہے،

میں اکیلا ہوں، میں نے (رشتے تعلق، دوست) سب کھو دیئے،

سب نے تنہا کر دیا،

اور ہاں میں اب بہت خوش ہوں، لیکن ایک بات مجھے کھاتی ہے،

میں اب دلیر نہیں رہا کیوں کہ میں نے درد لکھ دیا ہے، اب بہت سے لوگوں کی ہمدردیاں ملنے لگیں گی۔

ھیروں کی چوری

محمد سجاول خان

انسپکٹر بہلاج کل ہونے والی چوری کی واردات کی تحقیقات کے لیے سیٹھ اظہر علی کے بنگلہ پر موجود تھا۔

سیٹھ کی تجوری سے 40 کروڑ کی لاگت کے بیش قیمت ہیرے چوری ہوئے تھے۔ چور کھڑکی کے راستے سے اندر آیا تھا۔ سیٹھ کو چوری کا پتہ اتنی جلدی نہ لگ پاتا اگر اسے ایک ڈیل کو فائنل کرنے کے لیے رقم نکالنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ صبح ہی صبح جب سیٹھ نے تجوری کو کھولا تو پیسوں کو نکالتے وقت اچانک اس کی نظر ہیروں والے خانہ پر پڑی تو اس کا لاک ٹوٹا ہوا تھا۔۔ جب سیٹھ اظہر نے خانہ کو کھولا تو ہیروں کو موجود نہ پا کر وہ بھونچکا رہ گیا۔۔ اس نے فوراً اپنے اعصاب پر قابو کیا اور پولیس اسٹیشن فون کیا۔ تھانہ کا انچارج اس کا دوست تھا۔ اس نے سے اپنی قابل لوگوں کو بھیجا۔ وہاں سے انسپکٹر بہلاج اپنی ٹیم کے ساتھ فوراً ہی موقعہ واردات پر پہنچ گیا۔ پہلی فرصت میں ٹیم نے موقعہ پر موجود تجوری پر سے فنگر پرنٹ اٹھا لیے اور ارد گرد شواہد موجود شواہد کی تلاش کرنے لگے۔۔۔ اور اب انسپکٹر گھر میں موجود ملازموں سے تفشیش کر رہا تھا۔۔

سیٹھ اظہر علی اس وسیع و عریض بنگلہ میں اپنے تین ملازموں کے ساتھ رہتا تھا۔ بنگلہ میں ٹوٹل 10 کمرے تھے اور ایک مہمان خانہ تھا۔ تمام ملازم بنگلہ کی پچھلی طرف کوارٹر میں رہتے تھے۔

جن میں ایک باورچی ایک ڈرائیور اور ایک گھر کی صفائی کے لیے ملازم تھا۔ وہ سب کے سب سیٹھ کے ساتھ برسوں سے تھے اور سیٹھ کو ان سب پر مکمل اعتماد تھا۔۔ وہ ہیروں کی چوری والے معاملے میں ان سب میں سے کسی پر بھی شک نہیں تھا اور اس نے انسپکٹر کو بھی ان سے تفشیش کرنے سے منع کیا۔ مگر انسپکٹر بہلاج نے اس حکم کو یکسر نظر انداز کیا۔ اس کی نظر میں سب اسی وقت ہی بے قصور گنے جاتے جب تک وہ خود انہیں بے قصور نہ کہے۔۔

انسپکٹر نے سب ملازمین کو ایک ایک کر کے کمرے میں بلایا۔۔

سب سے پہلے باورچی مہتاب کو بلایا گیا۔

انسپکٹر بہلاج نے تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیا۔۔مہتاب چہرے مہرے سے معصوم اور بے ضرر دکھائی دیتا تھا۔۔اندر آتے ہی سب سے پہلے انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔" کل رات تم کہاں تھے۔؟"

"جناب! میں کل اپنی بیمار ماں کی مزاج پرسی کے لیے لاہور گیا تھا۔۔کل رات کو ہی میں واپس آیا ہوں۔"مہتاب نے جواب دیا۔

"ہمم۔اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کل تم لاہور میں ہی تھے؟"بہلاج نے پوچھا

"جناب میری ماں ایک سال سے بیمار ہے اور میں تقریباً 20'25 دن کے بعد اس کے پاس جاتا ہوں۔آپ چاہیں تو ہسپتال والوں سے پوچھ سکتے ہیں۔"مہتاب نے معصومیت سے جواب دیا۔

"اچھا۔تم ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔"بہلاج نے سے باہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا

مہتاب خاموشی سے اٹھا اور دروازے کی جانب چل پڑا۔اچانک دروازے کے پاس جا کر وہ پلٹا اور اپنی جیب سے ایک فوٹو نکال کر بہلاج کی جانب بڑھا دیا۔

"جناب میں کل جب اپنی ماں سے ملنے ہاسپٹل گیا تو وہاں ایک فوٹو گرافر بھی اپنی ماں سے ملنے آیا ہوا تھا۔اس نے وہیں میری ایک تصویر بنائی۔

انسپکٹر نے وہ تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی۔اس تصویر میں مہتاب ایک کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔جس کے پس منظر میں مینار پاکستان نظر آ رہا تھا اور ساتھ ہی ایک کیلنڈر لگا ہوا تھا جس میں کل کی تاریخ واضح نظر آ رہی تھی۔اس نے وہ فوٹو اپنے شواہد جمع کرنے والے بیگ میں دیگر دوسرے شواہد کے ساتھ رکھ دی۔۔

دوسرے نمبر پر صفائی والا تیمور کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک دراز قامت شخص تھا۔بہلاج نے اس سے بھی یہی سوال کیا کہ کل رات وہ کہاں تھا۔۔

"سر کل رات میں اپنے کوارٹر میں ہی تھا۔"

"تم نے کل رات کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی۔"بہلاج نیا سے کریدتے ہوئے کہا

"نہیں جناب ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ارے ہاں کل رات کو جب میں رفع حاجت کے لیے باہر نکلا تو کرم دین کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور اس کے کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا حالانکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوتا ہے۔"تیمور نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"ہمم۔یہ کرم دین کون ہے؟"

"جناب وہ ہمارے بنگلہ کا ڈرائیور ہے۔"

"اچھا تم جا سکتے ہو۔"بہلاج نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

آخر میں کرم دین کمرے میں داخل ہوا۔

وہ شکل سے ہی مکار دکھائی دیتا تھا۔اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سے کمینگی ٹپک رہی تھی۔۔

انسپکٹر بہلاج نے اس سے بھی یہی سوال دہرایا۔۔

" کل رات کو میں اپنے کوارٹر میں ہی تھا" کرم دین نے رکھاء سے جواب دیتے ہوئے کہا

" کل رات کو تم سارہ وقت اپنے کمرے میں ہی رہے؟" بہلاج نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا

"میں کل رات کو اپنے کمرے میں سو رہا تھا تو سارا وقت اپنے کمرے میں ہی رہا ہونگا۔" کرم دین نے بدتمیزی سے کہا۔

"تو پھر رات کو تمہارے کمرے کا بلب کیوں روشن تھا اور تمہارے کمرے کا دروازہ ں ھی کھلا ہوا تھا۔؟۔" بہلاج نے اپنے غصہ کو قابو کرتے ہوئے کہا۔

"وہ وہ۔۔۔مم میرا رات کو جی بہت گھبرا رہا تھا تو تازی ہوا کھانے باہر نکل گیا۔" کرم دین نے ہڑ بڑاتے ہوئے کہا

" کیا تمہارا جی روز ہی ایسے گھبراتا ہے کہ کل کوئی خاص بات تھی۔" بہلاج نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

" نہیں نہیں جناب صرف کل ہی" کرم دین نے اٹکتے ہو جواب دیا

"اچھا۔تم جاسکتے ہو اور سنو جب تک اس کیس کی تحقیقات مکمل نہیں ہو جاتی تم لوگ یہ شہر چھوڑ کے نہیں جاسکتے۔" انسپکٹر بہلاج نے کہا۔

پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں بیٹھا انسپکٹر بہلاج مسلسل اسی کیس کے متعلق سوچ رہا تھا۔۔فارنسک رپورٹ اس کی ٹیبل پر پڑی تھی اور تجوری پر صرف سیٹھ اظہر علی کے ہی نشان ملے۔چور بڑا شاطر تھا اس نے تجوری پر کوئی بھی نشان نہیں چھوڑا تھا۔شک کا دائرہ گھوم پھر کر کرم دین پر آ رکتا تھا۔۔سوچتے سوچتے اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگی۔۔جیسے کوئی بہت اہم بات اس کو یاد آ گئی

پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں بیٹھا انسپکٹر بہلاج مسلسل اسی کیس کے متعلق سوچ رہا تھا۔۔فارنسک رپورٹ اس کی ٹیبل پر پڑی تھی اور تجوری پر صرف سیٹھ اظہر علی کے ہی نشان ملے۔چور بڑا شاطر تھا اس نے تجوری پر کوئی بھی نشان نہیں چھوڑا تھا۔شک کا دائرہ گھوم پھر کر کرم دین پر آ رکتا تھا۔۔سوچتے سوچتے اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگی۔۔جیسے کوئی بہت اہم بات اس کو یاد آ گئی ہو۔۔اس نے شواہدات والے بیگ سے کوئی چیز نکالی اور محدب عدسے سے اس کا جائزہ لینے لگا۔۔اس کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہو گئی اسے اپنے کام کی چیز مل گئی تھی۔

باورچی مہتاب کو پولیس سیٹھ اظہر علی کے ہیروں کی چوری کے الزام میں گرفتار کر کے لے جا رہی تھی۔اس کے کمرے سے ہیرے ایک بیگ میں پڑے ہوئے مل گئے۔۔

انسپکٹر بہلاج لاونج میں بیٹھا اظہر کے ساتھ بیٹھا چاے پی رہا تھا۔۔

"انسپکٹر صاحب آپ کو پتہ کیسے چلا کہ تینوں ملازموں میی سے باورچی ہی اصل چور ہے۔؟" سیٹھ نے استفسار کرتے ہوئے کہا۔

"جناب وہ کہتے ہیں نا کہ چور چاہے کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو اپنی ہی کسی غلطی سے پکڑا جاتا ہے۔

اور اس کیس میں غلطی مہتاب سے یہ ہوئی کہ وہ اپنے جھوٹے پن کا ثبوت خود ہی مجھے دے گیا۔" بہلاج نے ہنستے ہو کہا۔

"وہ کیا" اظہر نے پوچھا۔

"وہ تصویر جو اس نے مجھے دی۔۔ وہ تصویر ایک ایسے کیمرے سے کھینچی گئی تھی جس میں تصویر کے ساتھ ایک کونے تاریخ بمعہ ماہ و سال

بھی آ جاتی ہے۔۔وہ بہت ہی باریک ہوتی ہے اور عام آنکھ سے نظر نہیں آتی مگر جب میں نے اسے محدب عدسے سے دیکھا تو وہاں تاریخ تو کل والی ہی تھی مگر سال پچھلا تھا۔۔جس کی وجہ سے اس کی غلطی پکڑی گئی۔۔وہ کل کہیں نہیں گیا تھا بلکہ وہ اسی شہر میں تھا۔اور دوپہر کو ہی موقعہ دیکھ کر ہیروں پر اپنے ہاتھ صاف کر لیے۔۔یہ سب اس نے دوران تفتیش بھی قبول کر لیا ہے۔۔"بہلاج نے چائے کی سپ لیتے ہوئے کہا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے مگر اسے میری تجوری کا کوڈ کیسے پتہ چلا۔؟"اظہر علی نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"ایک دن جب وہ آپ کو کھانا دینے آپ کے کمرے میں آیا تو وہی اس نے اپ کو تجوری کھولتے ہوئے دیکھا تھا اور کوڈ یاد کر لیا تھا۔" بہلاج نے جواب دیا۔

"اچھا سیٹھ صاحب مجھے اجازت دیجئے زندگی رہی تو انشااللہ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔"انسپکٹر بہلاج نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ انسپکٹر صاحب خدا حافظ.

جھیل کنارے

محمد ایوب صابر (سیالکوٹ)

صبح کے وقت جب سورج کی کرنیں جھیل کے شفاف پانی پر پڑیں تو ساری جھیل چاندی کی طرح چمک اُٹھی۔مرغابیاں پر پھیلائے پانی کی سطح پر اتریں تو اُن کی خوشی دیدنی تھی۔دریائی بطخیں بھی اپنے پروں کر پھیلا کر چھپ چھپ پانی اڑا کر محظوظ ہو رہی تھیں۔جب وہ اپنے پر پھڑ پھڑاتیں تو پانی کے قطرے موتیوں کی طرح پروں سے پھسلتے ہوئے پانی میں اپنا وجود حل کر دیتے۔پانی کے اندر مچھلیاں سطحِ آب سے ذرا نیچے تیرتے ہوئے کبھی کبھی تھوڑا سے سر باہر نکال کر فضاء کا نظارہ کرتیں تو یوں لگتا جیسے وہ ہوا سے آکسیجن لے کر اپنے پھیپھڑوں میں بھر رہی ہوں حالانکہ اُن کے لئے آکسیجن پانی کے اندر ہی مہیا ہوتی ہے۔

اچانک پرندوں نے پانی کی سطح پر پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھڑ پھڑانا شروع کر دیا۔بطخیں کیں کیں کرتی اِس طرح چلّا رہی تھیں جیسے ایک دوسرے کو متوقع خطرے سے آگاہ کر رہی ہوں۔مرغابیاں اپنی گردنوں کو کبھی دائیں اور کبھی بائیں گھما رہی تھیں۔پرندوں کی چمکدار آنکھوں میں خوف کے سائے اتر آئے تھے۔اُن کی حرکات وسکنات میں بے بسی کا عنصر نمایاں تھا،جیسے موت کی دہلیز پر کھڑے انسان کی سانسیں اکھڑ رہی ہوں۔

جھیل کے اوپر فضاء میں ایک عقاب فوکر طیارے کی طرح پانی پر اترنے کے لئے جست لگا چکا تھا،جبکہ پرندے جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر ہو چکے تھے۔عقاب پر پھیلائے اپنی نظریں شکار پر

جمائے اپنے چُنگل کو روبوٹ کی طرح حرکت دے رہا تھا۔اُس نے پانی کی سطح پر ایک جھپٹا مارا اور ایک مچھلی اپنے چُنگل میں دبوچ کر دوبارہ فضاء میں محوِ پرواز ہو گیا۔بطخوں اور مرغابیوں نے دوبارہ جھنڈ کی شکل میں اکٹھا ہونا شروع کر دیا کیونکہ مزید خطرہ ٹل چکا تھا۔

عقاب نے مچھلی کو اِس طرح اپنے پُنجگل میں پکڑا کہ مچھلی کے لئے اپنے گلپھڑے پھُلانے اور دُم ہلانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ عقاب نے اپنے ناخن مچھلی کی چمکیلی کھال میں اِس طرح پیوست کیئے تھے کہ مچھلی ساکت ہو کر رہ گئی۔ عقاب نے اڑان بھری اور ایک درخت پر جا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے ماہر قصائی کی طرح مچھلی کے گوشت سے کانٹے الگ کر دیئے، پیٹ کی بھوک مٹانے کے بعد وہ اڑان بھرتا ہوا اپنے گھونسلے میں پہنچ گیا، جہاں مادہ عقاب پہلے سے موجود تھی۔

شام ہو رہی تھی، سورج کے سونے اور چاند کے جاگنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد ساری رات فلک پر ستاروں اور دھرتی پر جگنوؤں کی جھلمل ہونی تھی۔ جب رات کے وقت سارا جنگل سائیں سائیں کرنے لگتا تو چرند زمین پر اور پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں میٹھی نیند کے مزے لوٹتے۔ صبح ہوتے ہی سارا جنگل جاگ جاتا اور ہر طرف فضاء میں سَرگم شروع ہو جاتا۔ ایسے ہی شب و روز کا احوال پوچھنے موسم آتے جاتے تھے۔ یوں ایک دفعہ پھر موسم نے کروٹ لی اور جاڑا اپنی چادر سمیٹ چکا تھا۔

عقاب دو تین روز کے بعد گھونسلے میں لوٹا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ مادہ عقاب نے دو انڈے دیئے تھے۔ عقاب انڈوں کو دیکھ کر خوشی سے پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ اپنی چونچ مادہ عقاب کی چونچ پر مار کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ مادہ عقاب کا بھی سینہ خوشی سے پھول رہا تھا۔ اُن کے خاندان میں اضافہ ہونے والا تھا۔ اب انڈوں کو سانپ سے محفوظ رکھنا دونوں کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔

سانپ جانتا تھا کہ عقاب کی وجہ سے اُس کی نسل ختم ہو رہی ہے۔ وہ موقع ملتے ہی عقاب کے انڈے پینے کی کوشش کرتا۔ جنگل کا قانون اِسی کو کہتے ہیں کہ خود کو زندہ رکھنے کے لئے دوسرے کو ختم کر دو، اب یہ قانون جنگل تک محدود نہیں رہا بلکہ انسانی آبادیوں میں بھی یہی قانون رائج ہو چکا ہے۔

مادہ عقاب نے اب انڈے سینے تھے اور عقاب شکار کر کے خوراک کا انتظام کرے گا۔ مادہ عقاب شب و روز انڈوں کو اپنے نیچے پروں میں چھپا کے موسم کی شدت سے محفوظ رکھتی۔ چند روز بعد ایک دن اچانک ایک انڈے نے ہلنا شروع کر دیا۔ ابھی انڈے کی بیرونی دیوار سلامت تھی۔ پرندے کی جبلت اُسے انڈے کے اندر بچے کی نشاندہی کرتی ہے۔ مادہ عقاب نے اُس مقام پر چونچ ماری جہاں ننھے عقاب کی چونچ تھی۔ انڈے کی سفید کوٹھری میں چھوٹا سا روشندان بن گیا جس سے تازہ ہوا کا جھونکا انڈے کے اندر پہنچ گیا۔ ننھے عقاب نے انڈے کے خول میں حرکت کرنا شروع کر دیا۔ انڈے کی دیواریں خشک اور بوسیدہ ہو چکی تھیں جونہی ننھے عقاب نے حرکت کی تو سفید محل ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔

گلابی رنگت کی کھال میں ننھا عقاب باہر نکلا اور دنیا کو پہلی نظر سے دیکھا۔ اُس کی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں میں حیرت بھری تھی۔ عقاب کے کنبے میں ایک ننھے عقاب کا اضافہ ہو چکا تھا۔ مادہ عقاب نے اپنے بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھا تو سینہ خوشی سے معمور ہو گیا۔ ننھے عقاب نے دنیا میں آتے ہی آوازیں نکالنا شروع کر دیا۔ اب اُسے خوراک کی ضرورت تھی۔ اتنی دیر میں اُس کا باپ جھیل سے مچھلی کا شکار لے کر آ گیا۔ عقاب نے اپنے بچے پر نظر ڈالی اور مسرور ہو گیا، اُس نے مچھلی مادہ عقاب کے سامنے رکھ دی تاکہ دونوں اپنی بھوک مٹا سکیں۔ مادہ عقاب نے مچھلی کے گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر نوزائیدہ عقاب کے منہ میں رکھ دیا۔ ننھے عقاب

نے پہلی دفعہ اپنی زبان سے رزق کا ذائقہ چکھا تھا۔

اُس نے آہستہ آہستہ گوشت کا ٹکڑا پوٹے میں ڈال دیا۔ مچھلی کھا کر ننھا عقاب خاموش ہو گیا۔ اُس کے بعد مادہ عقاب نے مچھلی سے اپنی بھوک مٹائی۔ عقاب اِس سارے عمل کو بے تابی سے دیکھ رہا تھا۔ ایک انڈے سے تو بچہ نکل آیا تھا لیکن دوسرے میں ابھی باقی تھا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا کیونکہ عقاب کا پہلے دنیا میں آنے والا بچہ انڈے سے بعد میں نکلنے والے بچے کو مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِن میں ابھی تک ہابیل اور قابیل کی رسم چلی آرہی ہے۔

آج کے دور میں بھی انسان دوسروں کو مار کر زندہ رہنے کی فکر میں رہتا ہے۔ مادہ عقاب اپنے بچے کو سمجھانے کی کوشش کرتی کہ دنیا بہت وسیع ہے اور ہر پرندے کا رزق فضاء یا زمین کے اوپر موجود ہے۔ اُسے زندہ رہنے کے لئے اپنے بھائی کو مارنے کی بالکل ضرورت نہیں، ہر کوئی اپنے حصے کا رزق لے کر دنیا میں آتا ہے۔ اگلے روز دوسرے انڈے سے بچہ نکلنے کا امکان تھا۔ مادہ عقاب کی آنکھوں میں پریشانی کے سائے اتر آئے تھے۔ ذرا سی غفلت سے اُس کا بعد میں پیدا ہونے والا بچہ زندگی سے آنکھ ملاتے ہی موت کی وادی میں پہنچ سکتا تھا۔ ننھے عقاب نے آج پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ لیا تھا۔ اب وہ گھونسلے کے اندر ہی اِدھر اُدھر لڑھک رہا تھا۔

اچانک مادہ عقاب کے دوسرے انڈے نے بھی سرکنا شروع کر دیا۔ مادہ عقاب نے چونچ مار کر حسبِ معمول سوراخ کیا اور بچے نے سانس لینا شروع کر دیا۔ جونہی وہ انڈے سے باہر نکلا عقاب کے بڑے بچے نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ اُس سے نئے مہمان کا وجود برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر گھورنے کے بعد اُس نے نوزائیدہ بچے پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ مادہ عقاب متوقع صورتِ حال کے لئے خود کو تیار کر چکی تھی۔ وہ اپنے دونوں بچوں کے درمیان حفاظتی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ نوزائیدہ بچہ سہما ہوا گھبراہٹ سے چلّا رہا تھا۔ مادہ عقاب کا دل ملول تھا، اُس کے لئے دونوں بچوں کو محفوظ رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اتنی دیر میں بچوں کا باپ شکار لے کر گھونسلے میں آ گیا، مادہ عقاب نے کیں کیں کی آوازیں نکال کر اُسے تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ عقاب نے بڑے بچے کو مچھلی کے ٹکڑے کھلانا شروع کر دیئے اور مادہ نے نوزائیدہ بچے کی ذمہ دار سنبھال لی۔

دونوں بچوں کی حفاظت ماں باپ کی اولیں ذمہ داری تھی لہٰذا ماں باپ اپنے فرائض انجام دینے کی خاطر باری باری گھونسلے میں قیام کرتے جب عقاب گھونسلے میں ہوتا تو مادہ شکار کرنے کے لئے اڑان بھرتی اور جب مادہ گھونسلے پر معمور ہوتی تو عقاب تلاشِ رزق میں چلا جاتا۔

عقاب کے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ اب وہ اڑان بھرنے اور شکار کرنے کے لئے بے تاب نظر آرہے تھے۔ مادہ عقاب نے اپنے دونوں بچوں کو شکار کرنے کے اصول سکھانا شروع کر دیئے۔ عقاب نے کہا کہ ”سب سے پہلا اصول کبھی پرواز سے اکتانا نہیں۔ کسی زخمی پرندے یا پانی میں ڈوبتے جانور کا شکار نہیں کرنا۔ تم عقاب کے بچے ہو، جس دن تم زخمی اور مردار پر جھپٹنے لگے اُس دن تم گِرگس کے قبیلے میں شمار ہو گے۔ تم فضاؤں کو تسخیر کرنے کے لئے اڑان بھرتے ہو، تمھاری جھپٹ اِس قدر توانا ہونی چاہیے کہ تمھارے چنگل میں آنے والا شکار زندگی بھول جائے۔ اپنے شکار پر نظریں جما کر رکھو تا کہ اُس کو پہلی ہی جست میں شکار کر سکو“۔ عقاب کے

دونوں بچے اپنی ماں کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔

موسم نے انگڑائی لی تو عقاب کے دونوں بچے اپنے گھونسلے سے نکل کر فضاء میں پرواز سے محظوظ ہونے لگے۔ وہ اکیلے ہی شکار کی تلاش میں چلے جاتے اور شام کو پیٹ بھر کے لوٹ آتے۔

عقاب اور مادہ عقاب خوش تھے کہ بچوں نے خود انحصاری حاصل کر لی تھی۔ خود انحصاری ہی دراصل خودداری کی سیڑھی کا وہ پائیدان ہے جو خودی کی منزل تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

ایک دن عقاب کا ایک بچہ زخمی حالت میں گرتے پڑتے گھونسلے میں واپس آیا۔ اُسے دیکھ کر ماں کا کلیجہ ہل گیا۔ ننھے عقاب کے کچھ پر ٹوٹے ہوئے تھے اور مشکل سے گھونسلے تک پہنچا تھا۔ عقاب نے اپنے بچے کو سینے سے لگایا اور زخمی ہونے کی وجہ دریافت کی۔ ننھے عقاب نے کہا ''تم نے کہا تھا کہ کسی ڈوبتے ہوئے جانور کا شکار مت کرنا''

''ہاں میں نے کہا تھا لیکن تم تو خود زخمی ہو''۔ بچے نے کہا کہ ''میں نے ندی کے ٹھنڈے پانی میں ڈوبتے ہوئے چوہے کو دیکھا تو میرا دل بھر آیا۔ میں نے اُسے آرام سے اپنے چُنگل میں اٹھایا اور پانی سے باہر لا کر اپنے پروں میں چھپا لیا۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا، میرے پروں میں آتے ہی وہ پُرسکون ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے اپنے پروں کے اندر کچھ کترنے کی آواز آئی، میں نے جلدی سے چوہے کو پروں سے باہر پھینک دیا اور اڑان بھرنے لگا۔ جب میں اُڑنے لگا تو میرے ایک طرف کے کچھ پر کٹ چکے تھے۔ چوہے نے مجھے اپاہج کر دیا۔ میں نے چوہے سے سوال کیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اُس نے کہا کہ یہ میری فطرت ہے۔ اتنی دیر میں ایک شکاری نظر آ گیا میں نے شکاری کے ہاتھ لگنے سے پہلے اڑان بھری اور گرتے پڑتے گھونسلے تک پہنچ گیا''۔

''میں نے دوسرے کے ساتھ نیکی کا حکم ضرور دیا تھا لیکن کسی کم ظرف کے ساتھ نہیں۔ کم ظرف کے ساتھ نیکی کا یہی انجام ہوتا ہے۔ بہرحال یہ تمھارے لئے ساری زندگی کا سبق ہے''۔ ننھے عقاب کی ماں نے اُسے کہا۔

عقاب کے بچے بڑے ہو گئے تھے، اب وہ اپنی مرضی سے اڑانیں بھرتے اور آزاد زندگی گزار رہے تھے۔ عقاب اور مادہ عقاب کی عمر 40 سال کے قریب ہو چکی تھی۔ اُن کا جسم بھاری ہونا شروع ہو گیا تھا۔ دونوں کی چونچیں زیادہ خمیدہ ہو چکی تھیں اور ناخن بڑھنے کی وجہ سے چُنگل میں پہلے کی طرح دم خم نہیں رہا تھا۔ وہ جب شکار کرتے تو پرندہ یا مچھلی تھوڑی سی مزاحمت کے بعد اُن کے چُنگل سے آزاد ہو جاتے۔ اب عمر کا فیصلہ کُن مرحلہ آ گیا تھا۔ چالیس برس کے بعد عقاب ہی نہیں انسانوں کی زندگی میں بھی ایک اہم دور شروع ہوتا ہے۔ تمام انبیاء کو چالیس برس کی عمر کے بعد ہی پیغمبری کی بشارت دی گئی۔ چالیس سال کے بعد سوچ میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوچ لااُبالی پن کے حصار سے نکل کر سنجیدگی کی دہلیز پر کھڑی ہوتی ہے۔

عقابی جوڑے کو اِس موڑ پر موت یا نیا ولولہ میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اگر وہ تبدیلی کے عمل سے نہ گزرتے تو اُن دونوں کا مرنا طے تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد ایک دن دونوں نے اپنے گھونسلے سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جنگل کے خوشنما درخت اور

ہریالی کو خیر باد کہنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ گھونسلا جسے اپنی چونچ سے ایک ایک ٹہنی کاٹ کر درخت کے اوپر 120 فٹ بلند دو شاخے پر بنایا تھا، اُسے چھوڑنے کا مرحلہ آ گیا تھا۔ ہجرت ایک تکلیف دہ عمل ہوتا ہے جو کبھی عزتِ نفس کو محفوظ رکھنے کی خاطر تو کبھی جان کی حفاظت کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔

صبح کے وقت عقابوں کا جوڑا لمبی پرواز کے لئے خود کو تیار کر چکا تھا۔ دونوں نے حسرت بھری نظروں سے اپنے گھونسلے کو دیکھا اور کسی پردیسی کی طرح ارمانوں بھرے دل کے ساتھ گھر سے نکل گئے۔ جھیل

کا جادوئی پانی اُنہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا لیکن اِس وقت جھیل کے قریب میں آنا زندگی سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ اُن کی منزل دور پہاڑی علاقہ تھا۔ اپنی آنکھوں میں اداسی بھرے دونوں زندگی کی تلاش میں اڑ رہے تھے۔ فضاء سے کتنے ہی دلربا مناظر انہیں دعوتِ نظارہ دے رہے تھے لیکن وہ شام سے پہلے پہاڑوں کی چوٹی پر پہنچنا چاہتے تھے۔

اُن دونوں کو سینہ بسینہ سفر کرتی اِس روایت کا علم تھا کہ چالیس برس کے بعد عقاب کو پہاڑوں پر جانا پڑتا ہے تا کہ تبدیلی کے عمل سے گزر کر سرخرو ہو سکے۔ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ تبدیلی کے عمل سے گزرنے کے لئے کچھ صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ ایک سیاہ رات کا اندھیرا جھیلنے کے بعد ہی نمودِ سحر کا مژدہ سنائی دیتا ہے۔

اُن کی زندگی میں مایوسی کے اندھیرے در آئے تھے۔ اب خدوخال اور سوچ کی تبدیلی ہی اُنہیں روشن مستقبل کی نوید سنا سکتی تھی۔ اِس تغیر و تبدل میں طویل جدوجہد درکار تھی۔ اگلے روز ہی انہوں نے پہاڑ کی چٹانوں پر اپنے ناخن اور چونچ تیز کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ یہ ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا لیکن زندہ رہنے کے لئے اِس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ دن کے اکثر اوقات پہاڑی سِل پر اپنے اپنے چُنگل رگڑتے، گویا ناک سے لکیریں نکالتے۔ کبھی یہ چونچ کے بڑھے ہوئے خم کو تراش کر چھوٹا کرنے کی سعی کرتے۔ اِس دوران کسی پرندے یا جانور کا شکار کرنا محال تھا۔ گوشت سے دوری اور پہاڑوں کی حدت سے اُن کے جسم سے فالتو چربی پگھل رہی تھی۔ زرشک شیریں کی خوراک سے اُن کے بدن کی ساری توانائی بحال ہو رہی تھی۔ اِن دونوں کے اندر جوانی کے ابتدائی ایام والی طاقت واپس آ رہی تھی۔ جہاں ایک طرف چونچ اور چُنگل کی تراش خراش کے عمل سے درد سہنا پڑتا تھا وہیں مچھلی اور پرندوں کا شکار چھوڑ کر زرشک شیریں اُن کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام دکھا رہا تھا۔ زرشک شیریں کے بارے میں حکماء کہتے ہیں کہ عقاب کی ساری پھرتی، طاقت اور نظر کی تیزی دراصل زرشک شیریں کی ہی مرہونِ منت ہے۔ حکماء تو دوا کے طور پر اپنے مریضوں کو مختلف امراض میں زرشک شیریں تجویز کرتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ اگر بدن میں عقابی پھرتی، ولولہ اور جھپٹنے پلٹنے کی طاقت مقصود ہے تو زرشک شیریں آزما کر دیکھ لیں۔

چند روز پہاڑوں پر قیام کے بعد عقابی جوڑے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اب اُنہیں اپنے بچوں اور جنگل کی یاد ستانے لگی تھی۔ وہ اپنے گھونسلے میں جانے کے لئے بے تاب تھے۔ پہاڑ کے نوکیلے پتھروں پر کافی وقت گزار لیا تھا۔ ایک خوشگوار صبح وہ جنگل کی طرف اڑان بھرنے کے پر تول رہے تھے۔ جب انہوں نے پہاڑ سے اڑان بھری تو پرانی سوچ اور بدن کی تمام غلاظتیں پہاڑوں کی چوٹی پر دفن ہو چکی تھیں۔ اُن کے سینوں کا بے جا ابھار ختم ہو چکا تھا۔ وہ دونوں نئے عزم اور نئی امنگوں کے ساتھ جنگل کی طرف محوِ پرواز تھے۔

پہاڑوں کی دلکشی نے پاؤں کی زنجیر بننے کی کوشش کی لیکن اُن کا قبیلہ اُنہیں اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔وہ اپنی باقی تیس سالہ زندگی محفوظ کر چکے تھے اِس لئے آنکھوں میں نئی چمک آ چکی تھی۔جب جنگل پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔بچوں کی یاد اُن کی بے چین کر رہی تھی۔اگلی صبح کا سورج ایک نئی امید کے ساتھ طلوع ہوا۔وہ جنگل میں اپنے بچوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر اڑنے لگے،ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ اپنے دونوں بچوں کو نیا گھونسلا بناتے دیکھ کر اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

☆......☆......☆

حسنِ نظر

ثنا خالق

دھانی... دھانی.... دھانی پتر کتھے رہ گئی اوہ دھانی...."

کیا بات ہے اماں کیوں شور مچایا ہوا ہے مر نہیں گئی ابھی زندہ ہوں.."ماں کی آواز پہ وہ منڈیر سے نیچے جھانکتی ہوئی بولی

کب سے آوازیں لگا رہی ہوں منہ میں روٹی ڈال کر بیٹھی تھی کیا؟"

روٹی نہیں ڈالی پورا محلّہ مجھے کلو کہہ کر بلاتا ہے اب تو عادت سی ہوگئی ہے ایسا لگتا ہے میرا نام دھانی نہیں بلکہ کلو ہی ہے اب تو جب کوئی دھانی کہہ کر پکارتا ہے تو لگتا ہے دھانی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں. پیدائشی کالا ٹھپا تو لگ گیا ہے مجھے باقی کی کسر محلے والوں نے پوری کر دی.."خفگی سے بولی

اچھا نیچے تو آ نا...."اماں چہرے پہ ہاتھ رکھے ہوئے بولی تو دھانی تڑنت سیڑھیاں اتر آئی اور اماں کے سامنے بیٹھ گئی

کل کچھ لوگ دیکھنے آ رہے ہیں یہ دیکھ ساتھ والی باجی نے پنکی بیٹی کا کتنا سوہنا سوٹ نکال کر دیا ہے کل یہ والا سوٹ پہن لینا۔

"اماں کیوں میرے رشتے کیلیے خود کو ہلکان کرتی رہتی ہو ہر دوسرے دن کسی نا کسی کو میرے سر پہ بیٹھا دیتی ہو وہ لوگ دیدے پھاڑ پھاڑ کر معائنہ کرتے ہیں اور کھا پی کر واپس جاتے ہی انکار کر دیتے ہیں کوئی مجھ جیسی لڑکی کو قبول کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا ہر کسی کو گورا رنگ چاہیے یہ دنیا گورے رنگ کی دیوانی ہے کوئی مجھ سے شادی نہیں کرے گا بھول جا میری شادی کو..."دھانی شد و مد سے سر ہلاتی ہوئی اندر چلی گئی تو اماں اکلوتی بیٹی کی بیکل و بیبسی کی ڈوری میں لپٹی ویران زندگی کو مزید اندھروں میں غرق ہوتا دیکھ کر اندر ہی اندر کلس کر رہ گئی۔

اس بار بھی ایسا ہوا تھا.. بھیڑ بکریوں کی طرح منڈی میں لا کر اسے پیش کیا گیا تھا ...اور خریدار اچھی طرح دیکھ بھال کر کے پے در پے سوالات کی بچھاڑ کر کے تسلی سے کھا پی کر چلے گئے اور جاتے ساتھ پیغام بھجوایا تھا...لڑکی کا رنگ زیادہ کالا ہے ہمارے بیٹے کیساتھ جچے گی نہیں... بندہ اس جاہل خاتون سے دریافت کرے کے جب لڑکی بچ نہیں رہی تھی تو اسے اتنے سارے سوالات اور پوچھ گچھ کرتے وقت خیال نہیں آیا تھا کے یہ تو میرے لڑکے کیساتھ جچے گی نہیں؟...انکار سن کر کلو ایک بار پھر دلگرفتہ ہوگئی وہ ہذیانی انداز میں حلق کے بل چیخنے لگی---"پتہ کیا ہے اماں ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ اپنے بیٹے یا بھائی کے لئے جب شادی کے لئے رشتہ ڈھونڈنے جاتے ہیں تو لڑکی کی خوبصورتی, لڑکی کی شرافت, لڑکی کے کام کاج, لڑکی کا رہن سہن, لڑکی کی تعلیم, لڑکی کا خاندان, جہیز, جائیداد میں حصہ, لڑکی کی پیدائش سے اسکی جوانی تک کی ہسٹری جن کی گواہی شرط اور لڑکے کے لئے

صرف اسکی نوکری ہوناہی بہت ھے نہ شکل وصورت اہم نہ کردار اہم، نہ چال چلن اہم، نہ اسکے دوست احباب اہم, نہ اسکا گھر والوں سے رابطہ تعلق اہم, نہ اسکے عشق معاشقے اہم، بس ایک نوکری اسکے سو عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ھیکیسی کی بیٹی بہن کے گھر جب دیکھنے جاتے ہیں تو پہلے کہلوا بھیجتے ہیں کہ لڑکی دیکھنے آرھے ہیں وہاں لڑکی کے دل پہ کیا گزرتی ھے. جو دل ودماغ میں مرتی تڑپتی دعائیں مانگتی سوچتی پاگل ہوتی ھے کہ کیا ہوگا,؟ میں پسند آوں گی یا نہیں؟ پسند نہ آئی تو لوگ کیا کہیں گے؟ پسند آئی بھی تو وہ لوگ کیسے ہوں گے؟

وہ لڑکا کیسا ھوگا جیسے ھزاروں سوالات اور اوپر سے جہالت یہ کہ لوگ کسی کی بہن بیٹی کو بلاتے ہیں انکو چلنے کا کہا جاتا ھے جیسے منڈی میں بھیڑ بکریوں کو کچھ قدم چلا کر پسند کیا جاتا ھے۔انکے گھر کھا پی کر او رواپس ایک پیغام بھجوا دیتے ہیں معاف کرنا ہمیں لڑکی پسند نہیں !!! ایسے لوگوں کو تیل کی گرم کڑاہی میں ڈال دینا چاہیئے اماں "وہ بلکتے ہوئے زمین پہ ڈھےسی گئی احساسِ کمتری نے اسے توڑ دیا تھا.... اماں نے آگے بڑھ کر اسے خود میں بھینچ لیا

وہ ہے فرشتہ نہیں؟ پری نہیں؟ ایک سادہ سی انسان ہے جس کے کچھ جزبات ھیں۔کچھ خواب ھیں کوئی عزت نفس ھے۔لیکن لوگ کب سوچتے ہیں افسوس اسکے دل کی خوبصورتی کو کبھی کوئی سمجھ ہی نا پایا اسکے چہرے کی سیاہی اسکے خوبصورت حساس دل کو بھی خاکستر کر گئی اسکے چہرے کی سیاہی اسکے دل کیساتھ ساتھ اسکے نام کیساتھ بھی جڑ گئی... وہ دھانی سے کلو باجی بن گئی پہلے پہل وہ سب کو بہت ڈانٹتی اپنی بیبسی پہ روتی اللہ سے شکوہ کرتی کے اسے کیوں اس قدر کالا بنا کر بھیجا لیکن پھر وقت کیساتھ ساتھ اس نے لوگوں کی تلخیاں برداشت کرتے کرتے صبر کرنا سیکھ لیا اب اسے کوئی کلو باجی کہتا یا کچھ بھی وہ کسی کی بات پہ ناراض نا ہوتی.

.. آخر کیوں اسکے رنگ کی وجہ سے انکی ذات پسمنظر میں چلی جاتی تھی, آخر کیوں لوگوں کو اسکا روشن دل نظر نہیں آتا تھا.. .

اس دشتِ ویراں میں ماں کے سوا اسکا کوئی نہیں تھا, باپ تو بیٹی پیدا ہونے کا سن کر ہی بیٹا پانے کی چاہ میں زندگی کی دوڑ میں ماں بیٹی تو تن تنہا چھوڑ گیا تھا... بیٹی کا نصیب بھی اسکے رنگ کی طرح سیاہی مائل نکلا تھا ..

کلو باجی.. کلو باجی..."بنٹی ہانپتا ہوا اوپر چبارے تک آیا تھا جہاں کلو ٹیک لگائے نجانے کن الجھنوں میں غرقاں تھی بنٹی کی آواز پہ اس نے سٹپٹا کر اسے دیکھا اور بولی.

کیا بات ہے بنٹی کیوں شور کر رہے ہو"

کلو باجی پنکی باجی نے بلایا ہے آپکو"

اچھا تم چلو میں آتی ہوں....."بنٹی کو بھیج کر وہ ساتھ والی پنکی باجی کے گھر چلی آئی....

سلام خالہ"

واعلیکم اسلام"

خالی پنکی باجی نے بلوایا تھا.."اسنے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا

جا چلی جاوہ اوپر اپنے کمرے میں ہے.."خالہ بول کر باہر چلی گئی تو کلو سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ گئی... سلام کرکے وہ ایک طرف بیٹھ گئی... پنکی

باجی موبائل پہ کسی سے بات کر رہی تھی... کلو کو دیکھ کر فون بند کر کے اسکے قریب آتے ہوئے بولی

کہاں تھی تم دو دن سے آئی کیوں نہیں؟

وہ باجی گھر پہ کچھ کام تھا.."اس نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا لیکن سچ تو یہ تھا کے اس بار بھی رشتے سے انکار نے اسے اندر تک توڑ دیا تھا نجانے وقت کی کیسی ستم ظرفی تھی جو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی دن بدن تضاد بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

جھوٹ مت بولو مجھے پتہ ہے تم دلگرفتہ ہو کر کمرے تک ہی محدود ہو گئی تھی لیکن اس سے کیا ہوگا؟ رشتہ ہو جائے گا؟ شادی ہو جائے گی؟ نہیں نا؟ پھر رونا کیسا... اچھا چھوڑ وان باتوں کو.... میرا مینی کیور پیڈی کیور کر دو...." گلابی و سرخ رنگت والی پنکی باجی مینی کیور پیڈی کیور کا سامان لاتے ہوئے بولی تا کہ اسکا دھیان بٹ جائے اور وہ ان وہموں سے باہر نکل آئے جو اسے اپنی لپیٹ میں لیئے ہوئے تھے.

پنکی باجی اللہ نے کتنا حسین بنایا ہے آپکو اوپر سے آپ اپنے چہرے اور ہاتھ پاں کا خیال بھی کتنا رکھتی ہیں.... کاش میرا بھی رنگ تھوڑا بہتر ہوتا تو رشتہ ہونے کی اک امید تو ہوتی ..."وہ پنکی باجی کا چاند سا روشن چہرہ دیکھتے ہوئے یاسیت سے بولی تو پنکی چند پل اسکا منہ دیکھتی رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی....

اٹھو آ میرے ساتھ"

کہاں باجی"

بس اب تم خاموش رہو گی سمجھی..."اسے خاموش کروا کر وہ ساتھ بنے چھوٹے سے پارلر نما کمرے میں گئی اس نے گھر پر ہی پارلر کھول رکھا تھا محلے کی ساری لڑکیاں پنکی باجی سے ہی تیار ہوتی تھیں.... کلو کی بیبسی دیکھ کر اسے رہا نا گیا تو سوچا کیوں نا اپنے ہنر کے جوہر کلو پہ ٹرائی کر کے دیکھے.... اسے اس محلے میں زیادہ ٹائم نہیں ہوا تھا... وہ اپنی پڑھائی کیلیے لاہور کے کسی ہاسٹل میں رہائش پزیر تھی اور یہاں شفٹ ہوئے انہیں چند ماہ ہی ہوئے تھے پنکی کے پارلر کا سن کر محلے کی عورتوں اور لڑکیوں نے مجمہ لگا لیا... آہستہ آہستہ اسکا پارلر کامیاب ہو گیا اب تو ہر وقت اسکے گھر رونق رہنے لگی تھی... محلے میں سب سے اور زیادہ دوستی اسکے کلو سے ہوئی تھی.... اسے سادہ طبیعت کی کم گو کلو بہت بھلی چنگی لگی تھی.......

باجی یہ سب کیا ہے؟.."پنکی کے ہاتھ میں طرح طرح کے کریمس کے ڈبے دیکھ کر وہ متفکر سی بولی

یہ ساری چیزیں فیشل کی ہیں اس میں بلیچ بھی شامل ہوتی ہے اور اب سے لے کر اگلے تین مہینوں تک تم میری کسٹمر ہو... یہ مہنگے پروڈکٹس میں بس اپنے لیے استعمال کرتی ہوں اسلام آباد سے خاص دوست سے کہلوا کر منگواتی ہوں.... یہ ایسا پروڈکٹ ہے جس کا کوئی سائڈ افیکٹ نہیں اسے ہم ہر بیس سے پچیس دن بعد استعمال کر سکتے ہیں.... آج ہم اپنا پہلا سیشن شروع کرتے ہیں مجھے امید ہے اللہ پاک ہماری مدد کریں گے"

پر باجی یہ سب چیزیں تو بڑی مہنگی ہیں میں بھلا غریب آپکو ان چیزوں کے پیسے کہاں سے دونگی, میں نے دیکھا تھا پچھلے ہفتے جب آپ نے شکیلا کو یہ سب رنگ برنگی کریمیں لگائی تھیں اسکے بعد اسنے بڑے نوٹ دیئے تھے آپکو پر میرے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے, آپ اپنا مال مجھ جیسی کلو پہ نا ضائع کریں...."وہ پھرتی سے اٹھتے ہوئے بولی تو پنکی نے بازو سے پکڑ کر اسے واپس بیٹھا لیا۔

بس بول لیا جو بولنا تھا اب میری سنو تم میری دوست ہو اور دوستی میں بھید بھا نہیں کیا جاتا اور نا ہی تولہ جاتا ہے اب چپ کر کر بیٹھو اور مجھے میرا کام

کرنے دو بیسر و پا خیالات میں الجھی رہتی اسی لیے تمہارا دماغ خراب رہنے لگا ہے "اس نے اپنے مخصوص انداز میں اسے سمجھایا تو کلو نیم رضا مندی دیتے ہوئے پہلے پنکی باجی کو دیکھنے لگی اور پھر کرسی سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں ۔

تقریباً ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کی جان فشانی کے بعد وہ کلو کو لیئے شیشے کے سامنے آئی اور اسے شانوں سے تھام کر آنکھیں کھولنے کا کہا... کلو نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو اسکی پژمردہ شکل پہلے کی نسبت کافی فریش اور صاف لگنے لگی۔کلو خفیف سا مسکرا کر پنکی سے لپٹ گئی فرط جزبات سے اسکے آنسو ٹوٹ کر پنکی کے شانے پہ بکھر گئے....

دن پے در پے گزرنے لگیکلو کے رنگ میں نمایاں فرق آیا تھا, پنکی کی کریمیں اسکے لیے مددگار ثابت ہوئی تھیں, بہت زیادہ تو نہیں لیکن اسکا چہرہ کابلِ قبول لگنے لگا تھا.. خوشی و شادمانی کی فراوانی سے اسکا کھل اٹھا تھا, ہر وقت کی غور و فکر نے اسکے چہرے کی تمام تر معصومیت کو بھی نگل لیا تھا۔وہ سیاہ فام ضرور تھی لیکن اسکے چہرے کے نقوش واضع تھے ... تیکھے مکمل نقوش والی کلو اب پہلے سے بہتر لگنے لگی تو جینے کی ساری حسرتیں ایک بار پھر سے لوٹنے لگیں ....

تین مہنے کی مقشتِ شاقہ کے بعد کلو کی سیاہی مائل رنگت میں فرق آ گیا تھا لیکن پھر بھی ویسے رنگ اتنی جلدی سے آنا مشکل تھا کے جس سے اسکے رشتوں کی لائن لگ جاتی ...اسکی عمر کا بھی خیال دل کے دریچوں پہ قابض ہو کر اسکی ماں کو پریشان کر رہا تھا... تین مہینوں کے لمبے انتظار کے بعد اماں نیا سے نیا جوڑا لا کر دیا اور پنکی باجی نے اسے تیار کر دیا....

سہج سہج قدم اٹھاتی دل کی بیترتیب چلتی دھڑکن پہ قابو پاتے ہوئے اس نے کمرے میں قدم رکھا ... میک اپ نے اسکے چہرے کو سنوار دیا تھا ... کلو کو دیکھ کر لڑکا اور لڑکے کی ماں ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے ...لڑکے کی ماں نے پہلے کہلوا بھیجا تھا کے لڑکا ساتھ آئے گا اب اماں انکار کیسے کرتی اسکی کلو کونسا عرش کی شہزادی تھی جو سامنے نہیں آ سکتی تھی ... کلو نے ناک منہ چڑھایا تھا لیکن پھر ہتھیار ڈال دیا...

لڑکے نے اِستفہامیہ انداز میں کلو کو دیکھا جو سر جھکائے زمین پہ نظریں گاڑھے بیٹھی تھی... پھر سوال و جوابات کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر رشتے کی ہامی بھر لینے کے بعد اختتام پزیر ہوا .... کلو نے بیساختہ سر اٹھا کر دیکھا وہ ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی کے جو ہو رہا ہے وہ حقیقت ہے کوئی خوشنوما خواب یا چہرے پہ نفاست سے کیے گئے میک اپ سے جو اسکے چہرے کے خدوحال نکھر گئے تھے اس وجہ سے یہ کرشمہ ہوا تھا ....منہ میٹھا کروانے لگے تو کلو ٹھہر سی گئی اور پھر ایک دم سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی ...لڑکے نے اور اسکی ماں نے تعجب سے آبرو سکڑتے ہوئے دیکھا تھا .... کچھ ہی دیر میں کلو واپس لوٹ آئی فرق صرف اتنا تھا اب کی بار اسکا چہرہ صاف تھا میک اپ سے عاری ... مختلف کریمیں اور ہر پندرہ دن کی بلیچ کے بعد اسکا چہرہ قدرِ بہتر ہو گیا تھا لیکن میک اپ سے اسکا رنگ نکھر گیا تھا اور اسے لگا شاید لڑکے والے دھوکے میں ہاں کر بیٹھے ہیں جبھی صابن سے منہ رگڑ رگڑ کر دھو کر واپس آئی ..... لڑکے نے آبرو اٹھا کر سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا جو قدم قدم چلتی ان کے پاس آئی اور آہستہ سے گویا ہوئی

معاف کیجیئے گا لیکن میرے چہرے کی چمک دیکھ کر آپ نے غلطی سے ہامی بھر دی ہو گی لیکن وہ صرف ایک میک اپ کا کمال تھا .. میں نہیں چاہتی کے آپ میرے چہرے کی چمک دھمک دیکھ کر فیصلے کریں ....جب کے حقیقت آپ کے سامنے ہے میرا رنگ نا قابلِ قبول ہے اس لیے میں چہرہ دھو کر آئی ہوں

اب آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی ....."...وہ غیر مرئی نقطے پہ نظریں جماتے ہوئے بول کر جانے لگی جب وہ لڑکا بول اٹھا

معاف کیجیئے گا کیا میں دومنٹ آپکی بیٹی سے اکیلے میں بات کرسکتا ہوں"" ہاں ہاں بیٹا کیوں نہیں اماں نے جوابی مسکرا کر کہا اور پھر لڑکے کی ماں کو لے کر باہر نکل گئی ....اب وہ دونوں کمرے میں اکیلے تھے کلو ہنوز چہرہ پھیر کر کھڑی رہی ...

میں آپ کی بات سے متفق نہیں ہوں شاید آپ ہر انسان کو ایک ہی پلڑے پہ رکھ کر انکا موازنہ کرتی ہیں ....میں ان لوگوں میں سے نہیں جو باہری خوبصورتی سے متاثر ہو جاں , میں نے ایک دنیا دیکھی ہے اور بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کے پاس چہرے کی چمک کے علاوہ کچھ بھی نہیں نا خوبصورت دل نا احساس , جزبات کی روح سے بلکل عاری ... آپ کو کیوں لگتا ہے ایسا کے آپ کا رنگ قابلِ قبول نہیں؟ آپ نے کبھی آسمان کو غور دے دیکھا ہے؟...جب وہ سیاہ ہوتا ہے تبھی تو چاند کو اپنی روشنی سے دنیا کو منور کرنے کا موقع ملتا ہے ... جبکہ سویر ہوتے ہی نیلے آسمان کی اوٹ سے سورج نکل کر ہر طرف آگ برساتا ہے ....میں آپ سے جھوٹ نہیں کہوں گا لیکن آپ اس دنیا کی سب سے خوبصورت انسان ہیں اپنے بارے میں اتنی گہری بات دوسرے کے سامنے بولنا بڑا ہمت والا کام ہے جو آپ نے اتنی آسانی سے کہہ ڈالا .... میں غیر شادی شدہ نہیں ہوں"

کلو یک دم چونک کر پلٹی تھی اور جواب طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی"

دو سال پہلے میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی وہ بہت خوبصورت تھی کندن جیسا چمکتا رنگ وہ ایک مکمل حسین پیکر تھی لیکن ظاہری خوبصورت کی چکا چوند مجھے زیادہ دیر لبھا نا سکی اور اسکا اصلی چہرہ سامنے آ گیا وہ مجھے اور میری محبت کو دھوکا دے رہی تھی .. اگر گورے رنگ اور حسین سراپہ کے پیچھے ایسا خوفناک چہرہ چھپا ہو تو آپ جیسی سادہ دل سادہ طبیعت انسان ایسی لاکھوں خوبصورت چہرے والیوں سے ہزار گنا بہتر ہیں .....

میرے لیے آپ کے چہرے کی رنگت سے زیادہ آپکے دل کا خوبصورت ہونا معنی رکھتا ہے اور یقین کریں آپکا دل بہت خوبصورت ہے مجھے اس رشتے سے کوئی اعتراض نہیں مجھے آپ جیسی ہیں ویسی ہی قبول ہیں , البتہ آپکو کوئی اعتراض ہے تو مجھے کوئی مسلہ نہیں...."وہ جو بھی تھا عام سی شکل وصورت والا لیکن اپنی باتوں سے وہ پراسراری شخصیت کا حامل لگا تھا.. کلو نے بغور اسکا چہرہ دیکھا اور خفیف سی مسکرا کر سر اٹھا کر چھت کو دیکھنے لگی آنکھیں بند کر کے یقیناً اس نے اللہ کی ذات کو اپنے بہت قریب پایا تھا .ایک موتی ٹوٹ کا اسکی پلکوں گرا تھا جسے اس اجنبی نے آگے بھڑ کر اپنی انگلی پہ چن لیا تھا

انٹرویو

رافعہ مستور صدیقی

ادب رنگ :اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟) تعارف، تعلیم، جائے پیدائش، سکونت، مشاغل، علمی وادبی سفر وغیرہ(؟؟

میرا نام رافعہ مستور ہے جو میرے والد صاحب نے رکھا . پیار سے سب رافو کہتے ہیں .بعد میں صدیقی اپنے والد کے نام سے لے کر میں نے خود ساتھ لگا لیا اور یوں میرا قلمی نام رافعہ مستور صدیقی ہے . چاچڑاں شریف ضلع رحیم یار خان میں پیدا ہوئی .. کتابیں پڑھنے کا شوق بچپن سے ہے مختلف رسالے اور کتابیں میرے بابا لا دیتے تھے جس کو پڑھ کر شوق مزید بڑھتا گیا . میں چھٹی جماعت میں تھی جب بابا نے نسیم حجازی کا ناول "اندھیری رات کے مسافر "پڑھنے کو دیا اور کہا کہ پڑھ کے مجھے سنانا.اس کے بعد سے ناول پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا . پر اس سے کہیں زیادہ لکھنے کا شوق ہے ..اچھی اچھی چیزیں بنانے کا شوق ہے پر انھیں کھانے کا زیادہ شوق ہے .

ادب رنگ : کب سے لکھ رہے ہیں؟ لکھنے کی ابتدا کب اور کس عمر سے کی؟

بہت چھوٹی تھی تقریبا آٹھ سال کی جب بابا نے ڈائری لا دی اور میں نے ان کی مدد سے لکھنا شروع کیا . بچوں کے رسالوں میں لکھتی رہی . جو کچھ وجوہات کی بنا پر چھوڑ دیا پھر اب میری دوست عائشہ کے کہنے پر سفرنامہ لکھا جس کو بہت پزیرائی حاصل ہوئی عمرے کا سفر نامہ جون کے شمارے ادب رنگ میں شائع ہوا .اس کے بعد مختلف اخبارات میں بھی شائع ہوا.

ادب رنگ : کس صنف پر طبع آزمائی کر رہے ہیں؟

میرے مختلف کالم بھی شائع ہو چکے ہیں . سفرنامہ لکھا .افسانے بھی .شاعری کرنا بہت پسند ہے جو کو وقتا فوقتا کرتی رہتی ہوں . پر ایک ناول لکھنے کا ارادہ ہے اور یہ شوق سر محمود ظفر اقبال ہاشمی کا ناول سفید گلاب پڑھ کر مزید بڑھ گیا .انشااللہ جلد ہی ناول بھی لکھوں گی ..

ادب رنگ : کیا آپ موجودہ دور میں تخلیق کی جانے والی نثر و شاعری سے مطمئن ہیں؟

مجھے رومانوی شاعری کی سمجھ نہیں آتی . نوجوان طبقہ زیادہ تر رومانی شاعری کو فروغ دے رہے ہیں . میں چاہتی ہوں حقیقت پر مبنی لکھا جائے..

ادب رنگ :شاعری کے بارے میں آپ کیا کہیں گے شاعری کیا ہوتی ہے؟

شاعری جذبات کی عکاسی ہے . کیا کچھ ہم پہ طاری ہے شاعری اس کی عکاسی کرتی ہے .شاعری ہمیشہ سچ بولتی ہے .

ادب رنگ :شاعری کا اگر ذاتی زندگی پر کوئی مثبت یا منفی اثر پڑا ہو تو؟

میرے بابا شاعر تھے . بچپن سے ہی شاعری سے لگا رہا . چھوٹی سی تھی بابا ہم بہن بھائیوں کے بیت بازی کے مقابلے کرواتے تھے اور سب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے . میرے اوپر تو ہمیشہ مثبت اثر چھوڑا ہے . شاعری ہمیشہ مثبت اثر ہی رکھتی ہے اگر پڑھنے والی سوچ مثبت ہو .

ادب رنگ : آپ کی نظر میں تنقید کتنی اہم ہے؟

تنقید بہت اہم ہے ۔ اور یہ بہت ضروری ہے اگر مثبت حوالے سے کی جائے ۔ پر کبھی کسی کو تنقید کا نشانہ بنا کر کسی کی تزلیل نہ کی جائے ۔

ادب رنگ : دور حاضر میں لکھاری اور نقاد کون زیادہ اہم ہے آپ کی نظر میں؟

میرے خیال میں لکھاری کے ساتھ تھوڑا تھوڑا نقاد ہونا بھی ضروری ہے ۔۔ پر یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ الفاظ اور لہجہ کسی کی تزلیل نہ کرے ۔ تا کہ اپنا مدعا آسانی سے بیان کیا جا سکے ۔

ادب رنگ : کسی شاعر یا ادیب کو بڑا شاعر بنانے میں زرائع ابلاغ کا کیا کردار ہے؟

کسی کو بھی شاعر یا ادیب بنانے کیلئیے زرائع ابلاغ کا بہت بڑا کردار ہے ۔ بے شک یہ صلاحیت انسان میں خداداد ہے پر اس کو سب کی نظروں میں لانے کیلئیے زرائع ابلاغ کا بڑا کردار ہے ۔

ادب رنگ : دور حاضر کے کن شعرا اور ادیبوں سے متاثر ہیں؟

دور حاضر کے کچھ ادیب مجھے متاثر کرتے ہیں جن میں محمود ظفر اقبال ہاشمی، عمیرہ احمد شامل ہیں ۔ پر آج کے شعرا زیادہ تر رومانوی شاعری کو فروغ دے رہے ہیں جس میں بہر حال حقیقت کی جھلک مجھے نظر نہیں آتی ۔ ویسے مجھے علامہ اقبال، مسعود اشعر صدیقی، ناصر کاظمی، فیض احمد فیض، جون ایلیا نے کافی حد تک متاثر کیا ہے ۔

ادب رنگ : نو آموز شعرا کا رجحان نظم کی طرف زیادہ ہے ۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

نوجوانوں میں آج کل یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر پایا جاتا ہے کہ جلد از جلد مشہور ہو جائیں ۔ جس کیلئیے وہ کچھ ایسا کوشش کرتے ہیں کہ سب ان کی پزیرائی کریں ۔ پہلی بات لکھنا کچھ بھی ہو آسان نہیں ہے ۔ پر غزل کی نسبت نظم لکھنا آسان ہے ۔ پر سب زیادہ تر نثری نظم کو ہی فروغ دیتے ہیں ۔

ادب رنگ : نثری نظم کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

نثری نظم کو بہر حال کبھی شاعری کا حصہ نہیں مانا گیا ۔ قمر جمیل لکھتے ہیں: نثری نظم دراصل اردو شاعری کی روایات سے انحراف ہے ۔ پر نو آموز شعرا کا رجحان نثری نظم کی طرف ہی ہے ۔ لیکن میرے خیال میں یہ بھی شاعری ہی ہے ۔

ادب رنگ : آپ کی ترجیحات کیا ہیں؟

میری پہلی ترجیح یہی ہے کہ میں جتنا ہو سکے بہتر لکھوں اور ادب کو فروغ دوں ۔ میں آگے بھی جتنا لکھوں گی کوشش یہی ہو گی کہ جس سے کوئی سبق ملے ۔ کچھ سنور جائے ۔

ادب رنگ : نئے لکھنے والوں کیلئیے کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟

نئے لکھنے والوں کیلئیے یہی پیغام دوں گی کہ جتنا ہو سکے بہتر لکھنے کی کوشش کریں ۔ انسان کو شروع میں مشکل ہوتی ہے رجیکشن کا بھی خوف ہوتا ہے اور بسا اوقات ان مراحل سے گزرنا بھی پڑتا ہے ۔ پر ہمت نہیں ہاریں رب کی ذات پر یقین رکھیں ۔ جو آپ کے حق میں بہتر ہے وہ آپ کو ضرور ملے گا ۔

سراب راہ....

سمیرا منشاء

"آنوش تم آج بھی لیٹ ہوگئیں -دیکھو میں بھی تمہاری وجہ سے پہلی گاڑی پر نہیں جا پائی "-حدیقہ نے منہ بسورتے ہوئے آنوش کی جانب دیکھا تھا جو نجانے کس خیال پر مسکرائے جا رہی تھی-

"آنوش لڑکی میں تم سے مخاطب ہوں" "-ہنہہ "...آنوش کو ہوش آیا-

"اوسوری ڈیر" -ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ میٹھی میٹھی باتوں سے اسے پھسلا رہی تھی -

"دیا "!اس نے حدیقہ کو پکارا" -دیکھو آج اسفند کی کلاس نہیں تھی -تو ہم نے سوچا تھوڑا سا وقت ساتھ گزار لیں -تم تو جانتی ہو نہ آجکل ہماری ملاقات نہیں ہو پا رہی"-پونی ٹیل کو لہراتے ہوئے اسکی کاجل زدہ آنکھوں میں بھی خوشی جھلک رہی تھی-

"اچھا ٹھیک ہے اب اس دھوپ میں جھلس کر گاڑی کا انتظار کرو "-حدیقہ نے بات ختم کرتے ہوئے کہا -وہ ویسے بھی آنوش کے پاگل پن سے اچھی طرح واقف تھی -وہ اسفند کے پیار میں بری طرح گرفتار ہو چکی تھی اور اپنی مصروفیات کے باوجود بھی پانچ دس منٹ کی ملاقات کیلئے وقت نکال ہی لیتی تھی -پھر حدیقہ کو بھی اسکے ساتھ بس اسٹاپ پر دھوپ میں جھلسنا پڑتا تھا -آج بس میں سارا راستہ وہ بہت خوش رہی -حدیقہ نے یہاں سوال کرنے سے تھوڑی پرہیز کی -اسکا ارادہ تھا کہ رات کو وہ اس سے خوشی کی وجہ پتہ کرے گی-

"اپیا.....اپیا کہاں ہیں آپ "- گھر میں داخل ہوتے ہی آنوش نے بہن کو پکارا اور ساتھ ہی پڑی کرسی پر بیٹھ کر شوز اتارنے لگی-اماں بابا کے گھر نہ ہونے کا خوب فائدہ اٹھایا جا رہا تھا .اونچی لمبی سی پیارے پیارے نین نقوش والی آنوش جب خوش ہوتی تھی تو اسکی خوبصورتی میں اور اضافہ ہو جاتا تھا -ابھی بھی دور سے آتی عاتکہ کی نظریں اس پر جم گئیں تھیں -وہ بہت حسین لگ رہی تھی اور اسکی آنکھوں سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ آج وہ کوئی اچھی خبر لے کر آئی ہے-

"نوشی چلو کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں - کیا آتے ہی محلّہ سر پر اٹھا لیتی ہو تم" -اپیا نے ہمیشہ کی طرح اسے یاد دلایا تھا کہ یہ صحن ہے انکا کمرہ نہیں -زبان دانتوں میں دبا کر اس نے شوز اٹھائے اور کندھے لٹکائے کمرے کی جانب چل دی-

"اپیا میری آج بھی اسفند سے ملاقات ہوئی "- کمرے میں آتے ہی وہ بے تابی سے بولنا شروع ہوئی-

"آپکو لگتا ہے نہ کہ اسے مجھ سے پیار نہیں اور نہ ہی وہ میری طرح پاگل ہے مگر اپیا ایسا بلکل بھی نہیں ہے -وہ تو بس مصروفیت کی وجہ سے"....اپیا کا بگڑتا چہرہ دیکھ کر اس کی زبان نے اچانک فل اسٹاپ لگایا تھا-

"اچھا اپیا..میری پیاری اپیا آپ اماں بابا سے بات کریں گی نا پلیز اپیا..اسطرح اسفند کیلئے بھی آسانی ہوگی -اور وہ ممی کو ہمارے گھر بھیج سکے گا -پلیز اپیا..،"وہ منت سماجت پر اتر آئی تھی-

"اچھا ٹھیک ہے -ابھی تم کھانا کھا لو میں کوئی اچھا موقع ڈھونڈ کر بات کرتی ہوں بابا سے مگر اس سے آگے میری کوئی گارنٹی نہیں-بس اماں بابا کے

آنے تک انتظار کرو ".اپیانے جان چھڑائی-وہ خوشی خوشی اٹھ کر بوا کے کمرے کی جانب چل دی-

آنوش اور عاتکہ دو ہی بہنیں تھیں جو فراز صاحب کی صاحبزادیاں تھیں -ان کی اماں نہایت نفیس خاتون تھیں اور محلے کے بچے انھیں اماں پکارتے تھے -ان سب کی دیکھا دیکھی آنوش اور عاتکہ نے بھی انھیں اماں ہی پکارا تھا -عاتکہ آنوش سے چار سال بڑی تھی اور آنوش کو اس نے بچوں کی طرح ہی پالا تھا -اسکی ہر ضرورت کا خیال اماں سے بڑھ کر عاتکہ نے رکھا تھا -اس گھر میں ان چار نفوس کے ساتھ ساتھ بوا بھی رہتی تھیں -عاتکہ اور آنوش کو یہی علم تھا کہ بوا کے شوہر اور بچے کا ایک کار حادثے میں انتقال ہو گیا تھا -اور اسکے بعد بوا کا دماغی توازن خراب ہو گیا تھا -وہ ایک اندھیرے سے بھرے کمرے میں بیٹھیں رہتیں اور انکی آنکھیں ہمیشہ نم رہتی تھیں -آنوش انکی لالی تھی -اور آنوش کو بھی انکی بہت عادت تھی -صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے اور واپس آتے ہی وہ بوا سے ضرور ملتی تھی -ویسے تو آنوش بہت سمجھدار لڑکی تھی مگر پچھلے دو ماہ سے اسفند نامی یونیورسٹی فیلو نے اسے پاگل کر رکھا تھا-

اس کے علاوہ اپیا کی منگنی ہو چکی تھی اور ان کے سسرال والے بابا کے بہت اچھے دوست تھے .... دونوں خاندان کی آپس میں گہری دوستی تھی.ان کے دو بیٹے تھے ایک خرم جس کی منگنی عاتکہ سے ہوئی تھی اور ایک زاویار جو خرم سے چھوٹا تھا

بوا کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح تر تھیں -اسکے کمرے میں آتے ہی انھوں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا وہ جیسے اسکی منتظر تھیں -پھر ہمیشہ کی طرح سائیڈ پر پڑی تین ٹوفیاں اٹھا کر اسکے ہاتھ پہ رکھی -آنوش کو انکی آنکھوں میں محبت صاف نظر آتی تھی -مگر آج وہ آنوش کے گلے لگ گئیں-اتنے سالوں میں ایسا پہلی بار ہوا تھا -آنوش نے انکے لمس کو محسوس کیا تھا -وہ بھی انکے ساتھ رو دی -بہت دیر رونے کے بعد انھوں نے اسے خود سے الگ کیا اور اسے جانے کا اشارہ کیا -وہ سمجھ گئی کہ انھیں اب آرام کرنا ہے -کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ کچن کی جانب چل دی-

"نوشی آج زاویار آیا تھا "-اپیا نے اسے خبر سنائی-

"واہ واہ تو انکو بھی ہماری یاد آئی "-آنوش اچانک ہی جذباتی ہوئی-

"ویسے اس میں یاد کی کوئی بات نہیں ہمیشہ وہ ہی آتا ہے اور فون بھی وہیں سے آتا ہے -تم لوگوں کی غلطیاں نکالنے سے پہلے اپنے بل کس سیدھے کر لیا کرو "-اپیا میں ایک دم اماں کی روح سما گئی تھی -نوشی کے اوسان خطا ہو چکے تھے-

" تمہیں بس یہ بتانا تھا کے میں نے بتایا اسے تمہارے اس نئے نئے عشق کے بارے میں -بس اب اسکی اور میری یہی دعا ہے کہ تمہیں کوئی نقصان ہی نا ہو جائے""-اپیا دیکھیں مجھے رلایا مت کریں -آپ جانتی ہیں میں نے کبھی ایک لمحے کو بھی ایسا نہیں سوچا کہ اگر وہ مجھے نہ ملا تو.....؟میری محبت میں اگر کی کوئی جگہ نہیں اور نہ ہی کسی شک کی جگہ ہے -اسفند کو مجھ سے پیار ہے اور وہ مجھے اپنائے گا -میں آپکو بتا رہی ہوں نا "-ایک دم سے اس نے اسفند کی سائیڈ لی تھی -

"ہاں ہاں میں بھی یہی چاہتی ہوں نوشی -اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے -عاتکہ نے اسے گلے لگایا -اس میں تو سب کی جان تھی-

اگلے دن صبح اسکا سر بہت بھاری ہو رہا تھا -رات کو بھی ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی مگر مجبورا اٹھنا پڑا تھا کیونکہ یونیورسٹی سے چھٹی کسی صورت نہیں کر سکتی تھی -ویسے بھی اب حدیقہ نوٹس دینے کے معاملے میں تھوڑی کنجوس ہو چکی تھی -وہ فورا اٹھی ،بوا سے ملی اور روز کی طرح ناشتہ کے بغیر ہی

تیار ہو کر بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔

کیا بات ہے حدیقہ تم آجکل چپ چپ کیوں رہتی ہو؟ آنوش نے حدیقہ کو اداس بیٹھے دیکھا تو اسی کے پاس جا کر بیٹھ گئی'. ارے تم کب آئیں 'حدیقہ ایک دم چونک کر بولی'. میں بس ابھی آئی ہوں مگر تمھارے ساتھ کیا مسلہ ہے.. سب خیر تو ہے نہ. آنوش سچ میں اسکے لیے فکر مند تھی . حدیقہ ہی اپیا کے بعد اسکی اکلوتی سہیلی تھی'. نہیں نہیں آنوش کوئی مسلہ نہیں بس یوں ہی ذرا طبیعت خراب ہے 'اس نے بات کو ٹال دیا'. اچھا ہم اب دوپہر کو ملیں گی ابھی چلو کلاس اٹینڈ کرتے ہیں'. حدیقہ نے کتابیں سمیٹتے اس سے بات کی اور دونوں کلاس کی جانب چل دیں.

وہ کلاس سے باہر نکلی اور حسب معمول موبائل نکال لیا. اسکے موبائل پر اپیا کی کال مسلسل آرہی تھی. اچانک ہی اسے پریشانی ہونے لگی'. اللہ خیر کرے اس سے پہلے تو اپیا نے ایسے کال نہیں کی 'خود سے باتیں کرتے کرتے اس نے اپیا کا نمبر ڈائل کیا.

نوشی .... اپیا کی آواز کانپ رہی تھی انکی آواز سنتے ہی آنوش کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا'. نوشی بوا اب اس دنیا میں نہیں رہیں'. اپیا نے اسکے دماغ پر ہتھوڑا برسایا... میں نے زاویار کو بھیجا ہے تم اسکے ساتھ گھر آجا. اماں بابا بھی ابھی ہی آئے ہیں '. کال ختم ہو گئی اسے اپنے ارد گرد کسی کی خبر نہ رہی. پلر کے سہارے کھڑے ہو کر اس نے فون بند کیا اور گیٹ کی جانب بڑھ گئی. اسے کھڑے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کے زاویار کی گاڑی اسکے سامنے آ کر رکی. زاویار کی حالت بھی بہت ابتر تھی. بوا سے ان دونوں کا رشتہ سب سے زیادہ گہرا تھا مگر آج وہ ہمیشہ کے لیے ان سے دور جا چکی تھیں.. آنوس خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی. گھر میں عجیب سا کہرام مچا ہوا تھا. بیچ صحن میں ایک چارپائی پر اس نے بوا کو دیکھا جو اس جہان سے ہر تعلق توڑ کر ہمیشہ کے لیے جا چکی تھیں.. شاید رب کو انکی اتنی ہی آزمائش درکار تھی. ایک دم سے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی . اپیا نے آ کر اسے سہارا دیا اور کمرے میں لے گئی. اسے روتا دیکھ کر بابا اسکے پاس گئے'. نوشی میرا بچہ .. صبر کرو تم تو خوش قسمت ہو تم تو اپنی بوا کے پاس ہی تھیں نہ مجھے دیکھو میں کتنا بدقسمت بھائی ہوں اتنے دن سے بوا کو دیکھا بھی نہیں تھا. بابا سے لپٹ کر روتے روتے اسکی ہچکی بندھ گئی. اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی یہ ایک دم سے زندگی نے کیسا موڑ اسکے سامنے لایا تھا. بوا کے جانے سے اسکی زندگی بالکل بے رونق ہو گئی تھی ..

ایک ہفتہ گزر چکا تھا اس نے نہ موبائل دیکھا تھا اور نہ ہی یونیورسٹی گئی. آج آٹھویں دن موبائل آن کیا تو سب کے ہی میسیجز موصول ہو رہے تھے . آج آٹھ دن کے بعد اسے اسفند کا بھی خیال آیا 'Want to discuss something'.

ان آٹھ دنوں میں اسکا صرف یہی میسج موصول ہوا تھا. آج اس نے یونیورسٹی جانا تھا اس لیے اٹھ کر تیار ہونے چلی گئی.

'آنوش ..'یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی اسفند کی آواز پر وہ رکی'. یار تم کہاں تھیں اتنے دن سے یہاں نظر بھی نہیں آئی'. وہ دور سے ہی سوال داغ کر اسکی جانب بڑھا مگر پاس آ کر اسکی آنکھوں کی نمی اور سرخی دیکھ کر مزید کچھ نہیں بول پایا'. آنوش.. آ کینٹین کی طرف چلیں مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے. 'وہ اسکی سنے بغیر کینٹین کی جانب چل دیا. آنوش بھی اس کے پیچھے چل دی.

'اسفند بوا اب اس دنیا میں نہیں رہیں..' کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے گویا اتنے دن گم رہنے کی وجہ سے آگاہ کیا.

اسفند اسکی فیملی کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا اس لیے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اسفند نے اپنی بات کا آغاز کیا.

آنوش پانچ دن پہلے مجھے ممی نے بتایا کے وہ میری منگنی کر رہی ہیں'. آنوش نے بے یقینی سے اسکی جانب دیکھا اسے اسفند کے چہرے پر کچھ نئے

رنگ نظر آ ئے. وہ مزید بول رہا تھا' میں نے بہت سچی محبت کی یقین کرو دل سے چاہا تھا تمہیں مگر میں ممی کو نہیں منا پایا. میں تمہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا اس لیے میں ابھی اپنے اس نئے رشتے کے آغاز پر ہی سب کچھ سچ سچ بتا رہا ہوں. اگلے اتوار کو میری کزن حدیقہ کے ساتھ میری منگنی ہے'. وہ مسلسل ٹیبل پر نظریں گاڑھے اسے اپنی کہانی سنا رہا تھا. حدیقہ کے نام پر اچانک آ نوش کے لب ملے تھے'. حدیقہ '

' جی تمہاری سہیلی حدیقہ جو کی کزن بھی ہوا کرتی ہے '. اسفند نے نارمل انداز میں جواب دیا '. دیکھو آ نوش زندگی ایک ہی انسان پر ختم نہیں ہو جاتی اس لیے ہی تو میں نے بھی کوئی ہنگامہ نہیں کیا اور آرام سے گھر والوں کی بات مان لی اب تم سے بھی مجھے یہی امید ہے کے تم بھی ایک پریکٹیکل لڑکی کی طرح اس بات کو نارمل انداز میں لوگی '. آ نوش کو اسکی کسی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا. یہ وہی اسفند تھا جو اس کو جدا ہونے کا سوچنے بھی نہیں دیتا تھا... اور اب وہ اتنے آرام سے کہہ رہا تھا زندگی کسی ایک کے جانے سے زندگی نہیں رکتی... اسے اس بات کا علم ہی نہیں تھا کے وہ اسے ہی اپنی زندگی مانتی تھی.. مگر یہ تو بس آ نوش کے اپنے اصول تھے جو اس نے اسفند کی محبت میں اپنائے تھے. اس سے جواب میں کچھ بھی نہیں بولا گیا. ایکسکیوز می کہتے ہوئے اس نے کتابیں اٹھائی اور گھر جانے کے لیے اسٹاپ کی جانب چل دی. آج اس کی ہمت سے باہر تھا کے وہ کلاسز اٹینڈ کرے... اب اسے سمجھ آیا تھا کے حدیقہ آجکل کیوں پریشان تھی. وہ بھی جانتی تھی کے اسفند اور آ نوش ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں مگر اب وہی اسکی زندگی میں شامل ہونے جا رہی تھی. اسکا تو کوئی قصور نہیں تھا اسفند ایک مرد ہونے کے بعد بھی اپنی محبت کے لیے کھڑا نہیں ہوا تھا وہ بیچاری کس کس کو صفائی دے کر رشتے سے انکار کر سکتی تھی.

بس پر بیٹھتے ہی اسکی نظر حدیقہ پر پڑی. وہ رو رہی تھی. آ نوش کو آتے دیکھ اس نے ہاتھ جوڑے'. مجھے معاف کر دینا آ نوش میں کبھی بھی نہیں چاہتی تھی کے کچھ بھی ایسا ہو مگر میں مجبور ہوں. یقین جانو گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں کو اس وقت میری پوزیشن سمجھے. اسفند نے جھٹ سے منگنی کے لیے ہاں کر دی اب ان کے بعد میں کوئی بھی بحث کرنے کے قبل نہیں رہی'. وہ مسلسل روتے ہوئے اسے اپنی بے بسی سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی

'. نہیں حدیقہ تم کیوں معافی مانگ رہی ہو... میری تو اپنی محبت ہی میرے حق میں خالص نہیں رہی تمہارا کو قصور نہیں مرے دل میں تمھارے لیے کچھ برا نہیں ہے.. تم مجھے شرمندہ مت کرو' ہمت کر کے اس نے حدیقہ کو جواب دیا اور پھر اسکا ہاتھ چھوڑ کر اگلی سیٹ پر جا کے بیٹھ گئی.

زندگی موت سے بھی بدتر ہے مگر

کیا کریں کے موت بھی نہیں آتی...

گھر آتے ہی اپیا کے گلے لگ کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی. عاتکہ کو یہی لگا کے اسکو بوا کا دکھ ہے مگر رات کو اس نے ساری بات اپیا کو بتائی تو وہ خود بھی اسکے لیے پریشان ہو گئیں'. جانتی کو نوشی.. بوا کے جانے کے غم میں اماں بابا اتنے اداس ہیں کے میں تمھارے بارے میں انکو بتا ہی نہیں سکی. ذرا سوچو اگر میں نے انکو بھی بتا دیا ہوتا تو کیا ہوتا'. آ نوش اسکے کندھے کے ساتھ لپٹ کر بس روتی رہی اسکے پاس کوئی جواز کوئی جواب نہیں بچا تھا. اس سے پہلے وہ ہمیشہ اسفند کے حق میں بات کر لیتی تھی مگر آج وہی اسفند ہی بدل گیا تھا اب وہ کیسے اسکو ڈھال بنا سکتی تھی

'. دیکھو تمہیں میں کبھی بھی رونے کا مشورہ نہیں دوں گی. بس تم اسے بھول جا. کچھ فرق نہیں پڑتا دنیا میں اچھے لڑکے ختم نہیں ہو گئے. تمہیں اسکے زیادہ اچھا انسان ملے گا میری جان'. اپیا نے اسے تسلی دی.

" کیسے اپیا... آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کے میں بھول جاں. تکلیف ہے اپیا.. میرے سینے میں تکلیف ہے. آپ جانتی ہیں بوا کے جانے کا غم اتنا برا نہیں تھا کیوں کے انھوں نے یہ دنیا ہی چھوڑ دی تھی مرنے والوں کا دکھ سہا جا سکتا ہے مگر انکا دکھ کیسے سہیں جو ہمیں پل پل مار رہے ہوں جنکو اس بات کا اندازہ ہی نہ ہو کے کوئی کتنی تکلیف میں ہے. وہ بھی یہی کرے گا اپیا.. وہ مارے گا.. وہ مجھ پل پل مارے گا.. میں کیسے بھولوں گی اسے .. میں نے خالص محبت کی ہے اپیا.. ایک بے لوث محبت کی ہے.. میری محبت میں "یا "اور" اگر "تو تھا ہی نہیں.. پھر میں کیسے خود کو بدلوں.. میں کیسے اسے بھول جاں.' وہ ایک دم چلا اٹھی. عاتکہ نے اسے رونے دیا.. اسکے لیے یہی اچھا تھا.. جب تکلیف حد سے بڑھ جائے تو اسے آنسو اور الفاظ کی صورت دے دینی چاہیئے اور آنوش کا بس اس وقت عاتکہ پر ہی چلنا تھا. وہ چپکے سے اسے سنتی رہی اور نوشی بولتے بولتے سسکتے سسکتے سو گئی.....

زندگی کی سمجھ اکثر تب آتی ہے جب اچانک کوئی ہمیں بہت اوپر لے جا کر اچانک زمین پر دے مارتا ہے. آنوش کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا. یونیورسٹی میں اسکا دل بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا مگر اپیا کے سمجھانے پر وہ چلی جاتی تھی. آج بھی حسب معمول وہ یونیورسٹی میں تھی. لائبریری میں داخل ہوتے ہی اسکی نظر حدیقہ اور اسفند پر پڑی.

'ارے یار لو نہ. 'اسفند نے مٹھائی کا ڈبہ سامنے لہرایا '. دیکھو روز روز نہیں کھلاوں گا آخر کو میری منگنی کی مٹھائی ہے کھالو. اسی بہانے شاید تم لوگوں کی طرف سے بھی کوئی اچھی خبر سننے کو ملے '.اس نے دوستوں کو چھیڑا. حدیقہ بھی سہیلیوں کے ساتھ زبردستی مسکرا رہی تھی. آنوش سے وہاں ٹھرا نہیں گیا وہ ٹیرس پر آ گئی.

' کیسے .. کیسے ہوسکتا ہے. ایک میں ہی مر رہی ہوں. اسے کیوں کوئی مسلہ نہیں. اسے کیسے کوئی فرق نہیں پڑا. تو کیا اسے کبھی پیار تھا ہی نہیں. وہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے... انسان اتنی جلدی اس حد تک بدل سکتا ہے.... ایسا کیسے ممکن ہے. وہ کیسے اتنا نارمل ہے.. ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو . اسکے لیے سب ویسا ہی ہے.. وہ ہنس سکتا ہے وہ مسکرا سکتا ہے. میری جگا کسی اور کو دے سکتا ہے کیا میرا بس اتنا ہی مول ہے.. کیا سچ میں میں بے مول ہوں. بے بسی سے اسکی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے. اسے تکلیف تھی.. شدید تکلیف تھی. وہ اسے بتانا چاہتی تھی کے وہ تکلیف میں ہے یا شاید وہ اس سے سننا چاہتی تھی کے اسے بھی تکلیف ہے. اسکا دل کر رہا تھا وہ ایک بار جا کر اس کے سامنے چلا چلا کر سارا غم بہا لے... اسکے دماغ کی تمام یادیں اس آنسوؤں میں بہہ جائیں مگر یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا. اسفند تو شاید اسے بھول بھی چکا تھا. آج اسکو اتنا دیکھ کے ایک لمحے کو بھی اسے محسوس نہیں ہوا کے کبھی اسے کسی آنوش سے پیار تھا. خوب رونے کے بعد وہ آنسو صاف کرتے ہوئے کلاس اٹینڈ کرنے چلی گئی.

'اپیا یہ سب آج باہر کیوں نکال لیا؟' گھر میں داخل ہوتے ہی اسے اپیا کی شادی کا سارا فرنیچر باہر نظر آیا. چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ کمرے میں پہنچی تو اماں کی زبانی پتہ چلا کے اپیا کے سسرال والے اب شادی کے لیے اصرار کر رہے ہیں". واااماں... اسکا مطلب بہت مزہ آنے والا ہے" وہ ایک ڈیم اچھل کر بولی ". ہاں پگلی بہت مزہ آنے والا ہے بس اب اللہ تیرا جوڑ بھی کہیں سے بھیج دے تو میں سکون سے آنکھیں بند کر سکوں ". اماں نے اسے بانہوں میں لیا". اماں میرے لیے بھی کوئی نہ کوئی تو رکھ چھوڑا ہوگا نہ اللہ نے. آپ بس اپیا کی شادی کی فکر کریں نوشی کے رشتے کی فکر کو ابھی عمر پڑی ہے". اماں پر پھر سے جادو چلانے کی کوشش کر کے وہ مسکرا دی.

"ہاں.. ہاں اپیا اب تو بہن سے ملیں گی بھی نہیں نہ. اب تو آپ پرائی ہونے جا رہی ہیں ". کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے بیڈ پر بیٹھی عاتکہ کو آنکھیں دکھائیں". ویسے اپیا.. خرم بھائی بہت خوش قسمت ہیں. ہماری اپیا جو مل گئی انکو... کیا کمال کی بیوی ہوں گی انکی". وہ بولتے بولتے عاتکہ کے پاس بیٹھ گئی. اسے اپیا کا شرمانا بہت پیارا لگ رہا تھا". اپیا کی بچی ذرا اب یہاں آ ذرا. تمھارے خرم بھائی کی قسمت کے ساتھ ساتھ میں کسی اور بھائی کی قسمت بھی سنورنا چاہتی ہوں". اپیا نے اسے اپنے سامنے بٹھایا". اب بس میری طرف دیکھو اور مجھے سنو.. "اپیا نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے بولنے سے منع کیا ". دیکھو نوشی تمھارے ساتھ جو بھی ہوا اس کے بعد میں نہیں سمجھتی کے میں بس تمھارے آنسو دیکھ کر تم سے ہمدردی کروں اور تمہیں روتا چھوڑ دوں. تمھارے ساتھ ہمدردی کا مطلب یہی ہے کے میں کوشش کروں کے تم وہ سب بھول جا جو تمھارے ساتھ ہوا. دیکھو نوشی.. یہ جولڑکیاں ہوتی ہیں نہ ان کی اصل اور خالص محبت ان کے محرم رشتے سے ہی شروع ہونی چاہیئے . مگر اگر کوئی لڑکی غلطی کر بھی لے تو اسے غلطی سدھار لینی چاہیئے . تم میری لاڈلی جان ہو مگر جو بھی تم نے تب کیا غلط تھا ہاں تم بھی غلط تھیں میرے لاکھ سمجھانے پر بھی تم نہیں سمجھ پائی. ہاں تم نے خالص محبت کی تھی تم اسفند کے لیے خالص جذبے رکھتی تھی مگر دیکھو جب تک دونوں فریق اس معاملے میں ساتھ نہ ہوں تو کوئی رشتہ نہیں جوڑا جا سکتا اور تمھارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا". نوشی کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں.. اپیا ابھی بھی چپ نہیں ہوئیں". زاویار کو تو تم جانتی ہو نہ. بہت اچھا دوست ہے تمہارا. مگر تم اسے جانتے ہوئے بھی اسکے بارے میں کچھ نہیں جانتی. اگر تم کبھی اسکو جاننے کی کوشش کرتی تو شاید آج یہ حالت نہ بنتی تمہاری. نوشی یہاں میں یہی کہوں گی کے کچھ چالیں قسمت بھی چلتی ہے شاید تمھارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا مگر اب جب سب کچھ ختم ہو گیا ہے تو تم بھی آگے بڑھ جا...

دیکھو عورت اتنی بے مول نہیں ہوتی کے ایک کھوکھلے رشتے سے اسکی زندگی کا سکون اور درد جڑا ہو. آج زاویار آیا تھا میرے پاس اور وہ تمہیں اپنانا چاہتا ہے. اسکی یہ خواہش آج سے نہیں پچھلے دو سال سے ہے اور وہ مجھ سے یہ بات کر چکا تھا مگر اس کے کچھ عرصے کے بعد ہی تم نے مجھے اسفند کے بارے میں بتا دیا تھا تب ہی میں نے اسکو چپ کرا دیا تھا. شاید تمہاری محبت نے مجھے خودغرض بنا دیا تھا.

بات کرتے کرتے اپیا نے تکیے کے نیچے سے کچھ کارڈز نکال کر اسکے سامنے رکھے تھے. اسنے حیرت سے انکو دیکھا. اسکے بنائے سب کارڈز بہت نفاست سے پڑے دکھائی دیئے جو اس نے کبھی بوا اور اماں کے لیے بنائے تھے". یہ کارڈز بھی زاویار نے ایک سال پہلے مجھے دیئے تھے. جب اسے تمھارے اور اسفند کے بارے میں میں نے بتایا تھا وہ تمہیں کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا". نوشی بہت حیران ہوئی.. اسے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا کے زاویار اس کے بارے میں کوئی بھی ایسا خیال دل میں رکھے ہوئے ہے". دیکھو نوشی تم کبھی بھی اس رشتے کا سوگ ساری زندگی نہیں منا سکتی جسکا کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا". اپیا نے اسے خاموش دیکھ کر پھر سے بولنا شروع کیا". اس لیے میں یہی کہوں گی کے فیصلہ تم زاویار کے حق میں کرو رہی بات زاویار کی تو وہ تمہاری محبت تم سے نہیں مانگے گا بلکہ وہ تمہیں تمہاری محبت سمیت ایک اصل اور بہادر مرد کی طرح اماں بابا سے مانگنے آئے گا". اپیا کے لہجے میں فخر تھا". میری اب کیا مرضی ہو سکتی ہے اپیا.... میں نے تو کبھی کسی انسان کو ٹھیک سے پہچانا ہی نہیں. میں نہ اپنی دوست کو ساتھ رکھ پائی اور نہ اسفند سے محبت نبھا پائی... میں کیا کر سکتی ہوں... آپکو جو بھی مناسب لگے آپ وہی کریں مجھے آپ پر اور اماں بابا پر بھروسہ ہے اور اپیا میں تو پہلے ہی اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوں اب اور کوئی بھی غلط فیصلہ کر کے مزید شرمندہ نہیں ہونا چاہتی". بات ختم کرتے ہی

وہ اٹھ کر باہر نکل گئی.. کچھ الفاظ بظاہر بولنے میں معمولی ہوتے ہیں مگر یہ صرف بولنے والا ہی جان سکتا ہے کے وہ کس قیامت سے گزر کر ان الفاظ کو سامنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں. اس وقت آنوش کا بھی یہی حال تھا"..ہاں زاویار... آ بیٹھو"...عاتکہ نے زاویار کو آتے دیکھا تو کرسی اسکے سامنے رکھی "آپی میں زیادہ دیر بیٹھنے نہیں آیا..بس میں نوشی کے لیے یہ ایک پیغام لایا تھا آپ پلیز اس کو دے دینا".اس نے ہچکچاتے ہوئے بات مکمل کی اور ایک لفافہ عاتکہ کی جانب بڑھایا". واہ واہ مطلب میں یہاں اب کبوتری بن رہی ہوں" آپی نے اسے چھیڑا.

"..ارے نہیں آپی... آپ خود بھی اسے کھول کے پڑھ سکتی ہیں بلکہ اسکو دینے سے پہلے آپ ہی پڑھ لیں.. میں اس کبوتر والی محبت پر یقین نہیں رکھتا ورنہ اتنے سال اپنی محبت کون بیوقوف چھپاتا ہے بھلا"...اس نے مسکرا کر جواب دیا".ہاں یہ تو ہے ویسے مجھے تو اپنے بھائی پر فخر ہے اور اس کی محبت پر بھی". آپی نہیں خوشی سے اسکی بات مانی... کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا اور اس کے کہنے پر اس نے لفافہ کھولا.اسکی تحریر پڑھ کر آپی کو دل سے اس پر فخر ہوا. آج آپی نے دونوں کے اچھے نصیب کی دل سے دعا کی تھی.... نوشی جیسی معصوم اور نازک لڑکی کے لیے زاویار پرفیکٹ تھا.. نوشی کو جیسے ہی اپیا نے خط دیا وہ اسے کھول کر بیٹھ گئی"... آنوش نئی زندگی کے آغاز سے پہلے ہی اپنی پرانی زندگی کی یادوں کو جیسے آپ ختم کر کے آئیں گی اسی طرح وہ میرے دماغ سے بھی ختم ہو چکی ہوں گی اس لیے میں آپ سے اس معاملے پر کوئی بات نہیں کروں گا اور نہ ہی کوئی صفائی مانگوں گا. میں بھی ایک عام سا انسان ہوں اور میں جانتا ہوں کے ایک انسان سے کسی غلطی کی پوچھ گچھ کا حق کسی دوسرے انسان کو حاصل نہیں ہے. اور مجھے امید ہے کے اللہ مجھے اتنی ہمت ضرور دے گا کے میں آپکی زندگی کی خوشیاں آپکو لوٹا سکوں

.."...فقط... زاویار آنوش خط پڑھ کر مزید پریشان ہوگئی. اس نے اللہ سے ایک ہی دعا کی کے جو درد ابھی اسکے سینے میں ہے اس سے اسے نجات مل جائے. زاویار جسے سچے انسان کے ساتھ وہ خود بھی ایک سچی اور خالص زندگی گزارنا چاہتی تھی اور اسکی اس بے بسی میں اس وقت صرف رب سے مانگی دعائیں ہی اسکے کام آ سکتی تھیں... اماں اور بابا مہمانوں کے پاس بیٹھے تھے آج خرم کے امی ابو عاتکہ کی شادی کی تاریخ کے حوالے سے بات کرنے آئے تھے".

بھائی صاحب !!دراصل ہم آپ سے ایک اور بات کرنا چاہتے ہیں". آنٹی نے بولنا شروع کیا".. بچے کب بڑے ہوگئے پتہ ہی نہیں چلا. کل تک زاویار اور آنوش بچے بچے سے لگتے تھے.. ہمارے دونوں گھروں میں ان کی شرارتیں ہی نظر آتی تھیں مگر وقت جیسے پر لگا کر اڑ گیا ہو.اب دونوں بچے سمجھدار ہوگئے ہیں اور زاویار بھی کام کاج میں بھائی اور بابا کا ہاتھ بٹانا شروع ہوگیا ہے تو ہم سوچ رہے تھے کے کیوں نہ ہم آپکی دوسری بیٹی کو بھی اپنے ہی گھر لے جائیں"..

انٹی کی بات ختم ہوئی تو انکل بولنے لگے"... دیکھیں نہ بچے ماشااللہ سمجھدار ہیں اور آنوش بیٹی کی تعلیم بھی مکمل ہونے والی ہے تو کیوں نہ یہ فرض بھی پورا ہو جائے.. پھر آپ اور ہم بھی اپنی زندگی کچھ آرام سے گزار لیں". انکل نے گویا اماں کے دل کی بات چھین لی اور بابا بھی آج سچے معنوں میں خوش نظر آرہے تھے. انکی بیٹیوں کے لیے اتنے اچھے دامادوں کا ملنا واقعی خوش قسمتی تھی مگر بابا نے رسما ان سے کچھ ٹائم مانگا.انکو یقین تھا کے آنوش کو بھی اس رشتے سے کوئی مسلہ نہیں ہوگا. اور ٹائم لینے کا مقصد بھی یہی تھا کے وہ اس سے ایک بار پوچھ بھی لیں. یہ کام اب عاتکہ کے

ذمے لگنے والا تھا"۔ آپ آنوش بیٹی سے پوچھ کر ہمیں بتا دیجیئے گا ہم ایک ہفتے کے بعد آئیں گے اور تب ہی شادی کی کوئی تاریخ بھی دیکھ لیں گے"۔ انٹی نے ایک خبر اور سنائی۔ گویا انکو بھی یقین تھا کے فیصلہ ان کے ہی حق میں ہونا ہے۔ اماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا وہ پہلے ہی دونوں کو ساتھ رخصت کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ اگر یہاں بابا نہ بیٹھے ہوتے تو ایک ہفتے کے بجائے وہ ابھی ایک منٹ میں ہی ہاں بول لیتیں۔ پل بھر میں اس گھر کی شرمانے والی لڑکی اب دوسری لڑکی کو بھی شرمانے پر اکسا رہی تھی"۔ اپیا یہ غلط ہے آپ پورے چار سال بڑی ہیں مجھ سے میری شادی چار سال بعد ہونی چاہیئے "۔ نوشی نے ابھی کی تازہ تازہ خبر سناتی ہوئی اپیا کو شدید بری نظر سے دیکھا"۔ نوشی میری جان تم بچی بالکل بھی نہیں ہو بس تمہاری اپیا تھوڑی لیٹ بیاہ کر جا رہی ہیں اور ویسے بھی دیکھو نہ وہاں میں اکیلی کیا کروں گی"۔ اپیا بھی اب مذاق کے موڈ میں تھیں"۔ ہاں تو کیا ہر لڑکی جہیز میں اپنی بہن کو ساتھ لے کر جاتی ہے۔ آپ کوئی چھوٹی بچی ہیں جو اکیلے جانے سے گھبرا رہی ہیں۔ آج تک مجھے لگتا تھا بڑی بہن خوش قسمت لوگوں کو ملتی ہے مگر آج احساس ہوا کے اپیا بھی آپکو قربانی کی بکری بنا سکتی ہیں"۔ آنوش نے تیز تیز زبان چلاتے اپیا کی باتوں کا جواب دیا۔ مگر یہ وہ خود بھی جانتی تھی کے قربانی کی بکری تو اسے بننا ہی تھا۔ اس لیے بنا کسی اور بحث کے اس نے بھی شرماتے ہوئے جا کر اماں کو بتا دیا کے وہ اس رشتے کے لیے راضی ہے۔ شادی کی تاریخ ایک ماہ کے بعد کی طے پائی تھی۔ ویسے تو انکے سسرال والے بہت جلدی میں تھے مگر آنوش کی پڑھائی ختم ہونے میں بھی دو ہفتے باقی تھے اور اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک ماہ کا وقفہ رکھا گیا۔ اب دونوں بہنیں زیادہ تر شاپنگ میں ہی مصروف تھیں۔ اماں دونوں کو دیکھ دیکھ کر بس انکے اچھے نصیب کی دعائیں کر رہی تھیں۔ آنوش کی دعائیں بھی اللہ نے سن لی تھیں۔ اتنی

مصروفیت میں اسے پریشان ہونے کا موقع ہی نہیں ملا اور نہ ہی یونیورسٹی میں اسفند اور حدیقہ سے کبھی سامنا ہوا۔ بس وہ جب بھی بوا کا خالی کمرہ دیکھتی اسکی آنکھیں بھیگ جاتی۔

شادی بہت اچھی گزر گئی۔ اماں اور بابا بیٹیوں کو بیاہنے کے بعد عمرہ ادا کرنے چلے گئے اور آنوش ایک کالج میں پڑھانے لگی۔ زندگی اتنی بھی مشکل نہیں تھی جتنی کبھی آنوش نے سوچی تھی اسے اب ماضی کی کوئی بات نہیں رلاتی تھی بس کبھی کبھی اسے اپنا آپ زاویار کے سامنے بہت چھوٹا لگتا تھا۔ اللہ نے اس کے نصیب میں کتنا اچھا ہمسفر چنا تھا اور وہ اتنی نادان تھی کے ایک سراب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر خود کو ہلکان کر رہی تھی مگر شاید اسکی زندگی میں خوشیوں نے ایسے ہی آنا تھا"... میم ... یہ تو غلط بات نہیں.. آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کے شادی سے پہلے محبت کے اظہار میں سچائیاں نہیں ہوتی "۔ ایک سٹوڈنٹ نے آج آنوش کو ٹوکا۔ اسلامیات کا ایک ٹاپک پڑھاتے ہوئے آج اچانک بات محرم اور نامحرم کی طرف مڑ گئی"۔ دیکھیں بیٹا! محبت غیر محرم سے ہونا غلط نہیں ہے مگر اس محبت کی آڑ میں عادت کا تعلق بنا لینا غلط ہے۔ دیکھیں محبت exist کرتی ہے محبت واقعی بس ہو جاتی ہے مگر محبت میں مبتلا ہو کر حلال اور حرام کا فرق مٹا دینا کہیں پر بھی جائز نہیں ہے۔ ہم محبت کرنے میں غلط نہیں ہوتے مگر جب محبت کو عادت بنا لیتے ہیں نہ تب ہم غلط ہو جاتے ہیں۔ آپ بتائیں کیا صرف کسی سے محبت ہو جانے سے کوئی تعلق بن سکتا ہے کسی مرد اور عورت میں ... نہیں نہ ... اور اسلام میں تو کہیں بھی ایسی محبت کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور ایک مسلمان مرد عورت سے اپنی محبت کا اظہار نکاح کی صورت میں ہی کرتا اچھا لگتا ہے۔ نکاح سے پہلے محبت کے اظہار میں اکثر ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے.. بیوفائی ... آنسو ..... ایسا ہو ہوتا ہے نہ۔ آپ بھی جانتی ہیں میں بھی جانتی ہوں"... وہ دھیرے دھیرے بولتے ہوئے سب کچھ سمجھاتی گئی"۔ مگر میم اسلام تو لڑکی کو پسند کی شادی کی اجازت دیتا ہے نہ

"...ایک اور سوال آیا"..جی بالکل بیٹا...اسلام نے لڑکی کی پسند کا خیال رکھنے کی تعلیم دی. مگر پسند کو آپ آج کل کی محبت سے کیسے ملا سکتی ہیں.. میں اور آپ ہم سب جس محبت کے لیے اکثر رو رہی ہوتی ہیں کیا وہ صرف پسند کا رشتہ ہوتا ہے.. نہیں نہیں...ہم تو نہ محرم کو اپنی عادت بنا لیتے ہیں...اور پھر اسکے نہ ملنے پر ہمیں تکلیف ہوتی ہے.. عورت تو ہوتی ہی خالص ہے.. کسی مرد کو کوئی عورت کا دکھ ہو یا نہ ہو ایک عورت کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے کے اسے اسکا من چاہا مرد نہ مل سکے...اور وہاں ایک عورت کی کیا عظمت رہ جاتی ہے جہاں ایک مرد اس کے ساتھ بیوفائی کر کے اسکو دھتکار دیتا ہے.

اور رہی بات پسند کی تو پسند کا مطلب تو آپ جانتی ہوں گی ناں...جب آپ بازار جاتی ہیں تو آپکو جو ڈریس پسند آتا ہے اسے یا تو خرید لیتی ہیں یا مہنگا لگے تو چھوڑ دیتی ہیں مگر کیا کبھی ایسا ہوا کے کوئی ڈریس آپ ہر روز جا کر دیکھ کر آئیں صرف اس وجہ سے کے آپکو وہ ڈریس پسند ہے ".اسکا پوائنٹ اب مکمل کلئیر تھا". اور بیٹا جو لڑکیاں اسلام کی اس اجازت کو ڈھال بنا کر نا محرم رشتوں میں محبت تلاش کرتی ہیں ناں.. انکو اپنے محرم رشتوں کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے اور یہی تو اللہ کی جانب سے سزا ہوتی ہے". اس نے آج اولی زندگی میں حاصل کیا گیا سب سے اہم سبق اپنی کلاس میں منتقل کیا. وہ نہیں چاہتی تھی کے اس جیسی کوئی اور بھی آنوش پاگل پن میں اپنی محبت یا پاکیزگی کا سودا کسی کھوکھلے رشتے سے کر لے. لیکچر کے اختتام پر لڑکیوں کے چہرے پر پھیلا اطمینان دیکھ کر اس نے نگاہیں اوپر اٹھا کر رب کا شکر ادا کیا. شاید اسی طرح وہ اپنی غلطی کا ازالہ کر سکتی تھی. اپنی اتنی اچھی زندگی پر ہمیشہ کی طرح آج بھی نم آنکھوں سے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ کالج کے باہر گیٹ کی جانب مڑ گئی. جہاں روز کی طرح زاویار گاڑی کے سامنے کھڑا اسکا انتظار کر رہا تھا.......

باغی

حوریہ ایمان ملک (سرگودھا)

ہر نئی صبح کی کرن امید بن کر اسکے دل میں پھوٹتی اور ہر رات کی تیرگی اسے مایوسی کی چادر میں لپیٹ کر سلا دیتی۔۔۔صبح دم سا ہر شکست خوردہ قدم اٹھاتی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔۔آئینے میں اسے اپنا مسخ شدہ چہرہ دکھائی دیا۔۔طمانچے کی حدت سے اسکا گال اب تک دہک رہا تھا۔۔وہ خود کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔جگہ جگہ نوچے گئے جسم پر خون رس کر جم چکا تھا۔۔۔درد کی لہر اسکے پورے وجود میں ہلکورے لے رہی تھی۔ضبط کی اذیت سے دو چار آنکھیں روح پر لگے گھاؤ دیکھ کر برس پڑیں تو اسکے دکھ میں مزید اضافہ ہو گیا۔۔اس نے خود سے نظریں چرائیں اور اپنی ذات کی بکھری کرچیاں سمیٹتے ہوئے نڈھال ہو کر بیڈ پر گر گئی۔۔اس کا ذہن مختلف سمتوں میں بھٹکنے لگا۔وہ راہ فرار چاہتی تھی خود سے، حالات سے، مجبوریوں سے اور سمجھوتے سے ... مگر اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا....آخر میرا جرم کیا ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا ... عورت ہونا؟؟؟۔۔وہ عورت ہے اسی لیے بولنے کا حق چھین کر اسے صرف سننے اور ماننے کا حق دیا گیا ہے۔۔وہ کمزور ہے اس لیے اس کی راہ مسدود کر دی جاتی ہے، جس سے زندگی کے ہر محاذ پر ہار اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔۔آخر کب تک؟؟؟؟ایک عرصے سے جو لاوا اس کے اندر پک رہا تھا....وہ اب پھوٹنے کو بے تاب تھا۔۔وہ ایسے ہی کئی سوالوں میں الجھی پڑی تھی۔

اس کے دروں میں گھٹن حد سے بڑھنے لگی تو اس نے اٹھ کر کھڑکی سے دبیز پردے ہٹا دیئے۔۔روشنی سے اس کا وجود نہا گیا مگر اس کے اندر کی گھٹن و تیرگی کم نہ ہو پائی۔اسی بے دھیانی میں اس کی نظر میز پر رکھی ڈائری پر پڑی تو اسے اپنے احساسات کو قلم بند کرنے کا خیال آیا۔۔اسے پہلی بار احساس ہوا کہ لکھنے کا حق تو اب بھی اسکے پاس ہے جو اس سے

کوئی نہیں چھین سکا۔۔اب وہ روز اس میں عورت پر روا معاشرتی ناانصافیاں، تلخ رویے اور احساسات لکھنے لگی۔۔رفتہ رفتہ اس نے اپنے جیسے کئی کردار تخلیق کر لیے۔۔مگر روتے بسورتے کردار اسے کا منہ چڑاتے تو اس کے حزن میں مزید اضافہ ہو جاتا۔۔ساحر کوان کرداروں کی مظلومیت سے الجھن اور کوفت سی ہونے لگی تھی وہ لاشعوری طور پر اپنی خودترسی اور مایوسی کے حصار سے باہر نکلنے لگی تھی، اس کا تخیل بلند پرواز کرنے لگا، پھر وہ بے باک اور نڈر کردار تخلیق کر کے انہی کرداروں اور ان کے لیے تخلیق کردہ ماحول میں ہی سانس لینے لگی۔۔اس نے کھوئی ہوئی اور ریزہ ریزہ ساحر کو اپنے کرداروں میں ڈھونڈ کر اپنی شناخت کی راہ پالی۔۔جس سے وہ خود کو آزاد فضا کا راہی اور اپنی روح کو طاقتور محسوس کرنے لگی۔۔اس احساس نے اس کے دروں میں حوصلے کی نئی شاداب فصل اگادی....

پھر ایک روز اس نے دیکھا کہ اسے ذہنی وجسمانی طور پر نوچ کر لہولہان کر دینے والا مرد اپنی ڈھے چکی مردانگی کے ڈھیر پر کھڑا چلا چلا کر یہ اعلان کر رہا تھا کہ وہ باغی ہو چکی ہے، کیونکہ اس نے خود پر اٹھنے والا مرد کا ہاتھ روک لیا تھا۔۔ساحر آنسوں سے تر چہرے سے مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وہ واقعی باغی ہو چکی ہے یا جاگ چکی ہے۔۔۔

انسان

ریحانہ اعجاز (کراچی)

انسان جو اشرف المخلوقات ہے، گوشت پوست سے بنا قدرت کا ایک عجوبہ،، اشرف المخلوقات، مگر کمزور ترین ذی روح۔ مادرِ شکم سے لے کر دنیا میں قدم رنجہ ہونے اور آغوشِ لحد تک جانے کا یہ تمام راستہ پر پیچ، پر کٹھن اور خارزار ہے، لیکن بے حد مختصر، کوئی نہیں جانتا کب اور کہاں زندگی کی شام ہو جائے۔۔بے شک انسان کی مثال پانی کے ایک حقیر بلبلے کی مانند ہے جو ہلکے سے تھپیڑے سے مٹنے کو تیار رہتا ہے۔۔مگر افسوس آج کے اسنفسا نفسی کے دور میں ہر کوئی ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش میں محض مشین بن کر رہ گیا ہے۔۔۔آج کے انسان کے سینے مین دل نہیں جیسے پتھر فٹ ہے جسمیں کوئی اپنائیت، محبت، یگانگت، اور ہمدردی کسی قسم کا کوئی احساس ہی نہیں جاگتا۔ کیا واقعی ہم انسان ہیں۔۔؟ کیا واقعی ہم اشرف المخلوقات ہیں؟ آیئے اپنا اپنا محاسبہ کیجئے۔۔خود کو ٹٹولیئے کہیں آپ کے سینے میں بھی دھڑکتے دل کی جگہ پتھر نے تو نہیں لے لی۔۔۔؟ کیا ہم سب ماں، باپ، بہن، بھائی، عزیز رشتے داروں اور دوستوں سے محض اپنے مفاد کی خاطر وابستہ ہیں؟ یا واقعی ان سب سے ہمارا قلبی وروحانی تعلق۔۔۔؟ آپ سب کے خیال میں انسان کیا ہے۔۔۔؟؟ انسان اشرف المخلوقات ہے،۔اس روئے زمین کی سب سے معتبر مخلوق ہے انسان، انسان اپنے اچھے اعمال کی بدولت اچھے انجام سے نوازا جاتا ہے اور کوتاہیٔ عمل کی وجہ سے پستی میں جا گرتا ہے، انسان یقیناً اس روئے زمین کی تمام تر مخلوق میں اشرف ہے، ذہین وفطین ہے، عقل وفہم تو اللہ نے حیوانوں کو بھی عطا کی ہے لیکن بلاشبہ انسان میں فہم وادراک حیوان کی نسبت بہت زیادہ ہے، لیکن پھر بھی کبھی کبھی جہاں ایک حیوان یہ بات جانتا ہے کہ جان بوجھ کر آگ میں کودنا دانشمندی نہیں وہیں انسان اپنی ساری عقل وفہم ایک طرف رکھتے ہوئے جان بوجھ کر آگ میں کود پڑتا ہے جبکہ وہ اپنا نفع نقصان ایک حیوان کی نسبت زیادہ جانتا ہے، لیکن افسوس صد افسوس کہ انسان نے اپنی فہم و فراست سے ہر کام کو آسان کر ڈالا، لیکن انسانیت کا جامہ اتار پھینکا ہے، بقول حبیب حیدرآبادی۔۔!

انسان کی بلندی وپستی کو دیکھ کر☆☆☆☆انساں کہاں کھڑا ہے ہمیں سوچنا پڑا

اللہ نے انسان کو دل ودماغ عطا کیئے جن میں مختلف احساسات وجذبات پیدا کیئے آگے بڑھنے کا جذبہ رکھا، نت نئے تجربات سے آشنا کرنے کے لیئے دماغ میں متحرک خیالات کا سمندر مجزن کیا جس سے انسان نے دنیا میں نت نئی ایجادات کا انبار تیار کر ڈالا، وہ اپنی ذہانت، محنت ولگن سے وہ کام بھی کر جاتا ہے جو دوسری مخلوق نہ کر پائے، ترقی کی

شہزاد نیر

ہر ایک گام پہ صدیاں نثار کرتے ہوئے
میں چل رہا تھا زمانے شمار کرتے ہوئے

یہی کھلا کہ مسافر نے خود کو پار کیا
تری تلاش کے صحرا کو پار کرتے ہوئے

میں رشک ریش گل تھا بدل کے سنگ ہوا
بدن کو تیرے بدن کا حصار کرتے ہوئے

مجھے ضرور کنارے پکارتے ہوں گے
مگر میں سن نہیں پایا پکار کرتے ہوئے

جہان خواب کی منزل کبھی نہیں آئی
زمانے چلتے رہے انتظار کرتے ہوئے

میں راہ سود و زیاں سے گزرتا جاتا ہوں
کبھی گریز کبھی اختیار کرتے ہوئے

نہیں گرا مری قاتل انا کا تاج محل
میں مر گیا ہوں خود اپنے پہ وار کرتے ہوئے

یقین چھوڑ کے نیر گماں پکڑتا رہا
نگاہ یار ترا اعتبار کرتے ہوئے

بلال صابر (کولکاتہ ہند)

کسی پہ وقت یہ ہرگز نہ آئے بارش میں
کہ آنکھ تر ہو مگر مسکرائے بارش میں

نشست ہوگی بہت خاص واسطے میرے
مری غزل وہ مجھے جب سنائے بارش میں

قسم سے لطف بھی دگنا ہی آتا موسم کا
تمہارے ہاتھ کی ملتی جو چائے بارش میں

نکل پڑے ہیں یہ بادل تلاش میں اسکی
جو ان سے عشق مکمل نبھائے بارش میں

وہ آگ ہے ! یہ کہا میں نے اسکی سکھیوں کو
کرو کچھ ایسا کہ وہ آ نہ پائے بارش میں

کہا یہ میں نے کہو کب لکھوں غزل تم پر
کہا یہ اس نے کہ ہے میری رائے ! بارش میں!

حسین تو بھی ہے تیرا بھی حسن نکھرے گا
بلال تو بھی اگر بھیگ جائے بارش میں

بلقیس خان

لگا کے نقب کسی روز مار سکتے ھیں
پرانے دوست نیا روپ دھار سکتے ھیں

ہم۔اپنے لفظوں میں صورت گری کے ماہر ھیں
کسی بھی ذہن میں منظر اتار سکتے ھیں

بضد نہ ھو کہ تری پیروی ضروری ہے
ہم اپنے آپ کو بہتر سدھار سکتے ھیں

وہ ایک لمحہ کہ جس میں ملے تھے ہم دونوں
اس ایک لمحے میں صدیاں گزار سکتے ھیں

ہماری آنکھ میں جادو بھرا سمندر ہے
ہم اس کا عکس نظر سے نتھار سکتے ہیں

عظمی رحمان ہاشمی

(ام حذیفہ) گولارچی سندھ

طعنے دے گا یہ زمانہ بھی جدھر جائیں گے
آپ ہم سے جو بگاڑیں گے کدھر جائیں گے

زخم سہنے کی بنا رکھی ہے عادت ایسی
کوئی مرہم جو لگائے گا تو مر جائیں گے

دل کی دھڑکن میں ترا نام سجا رکھا ہے
بھول جائیں گے تو بس جاں سے گزر جائیں گے

ہم نے پھولوں کو سمیٹا تھا بڑی مشکل سے
تیری مسکان سے پھر سارے بکھر جائیں گے

اڑتے پنچھی کو گراتا ہے زمانہ لیکن
ترک پرواز نہ کر لوگ سدھر جائیں گے

ہم نے برسوں ترے مے خانے کو رونق بخشی
اب کے واعظ نے پکارا ہے ادھر جائیں گے

آج تقدیر کا شکوہ نہیں اچھا امبر
کل جو بویا تھا وہی کاٹ کے گھر جائیں گے

محمد ندیم قاصر (اوچشریف، بہاولپور)

اسے تو مجھ سے خار ہے
الگ ہی اس کا معیار ہے

آواز کوئل کی چال مور جیسی
آنکھ اس کی برہنہ تلوار ہے

وہ مانے نہیں تو ہم کریں کیا
قدموں میں رکھی اپنی دستار ہے

رہے تو وہی رہے پہلو نشیں
ورنہ جینا میرا پھر بیکار ہے

ربط بن نہیں پایا ہم میں
نفرت کی قائم دیوار ہے

کبھی سکوں اسے بھی میسر آئے
جو مدتوں سے دل بیقرار ہے

مجھے کیونکر تم غنیم جانے ہو
کیوں زہر آگئیں تیری گفتار ہے

قاصر تم یونہی تمنا لگائے بیٹھے ہو
وہ کسی اور کو جانے دلدار ہے

عثمان سکندر کاٹھیا

تو مرے دل میں دلربا آجا
دل ہے سونا پڑا، سجا، آجا

جو جہاں تھا وہیں پہ چھوڑ دیا
اس نے جب جب مجھے کہا "آجا"

آ کہیں ایک ساتھ بیٹھے ہم
ساری دنیا سے اب جدا، آجا

وہ پکارے مجھے مرے اندر
میں پکاروں مرے خدا، آجا

اب مجھے چھوڑنا پڑے گا تمہیں
مجھ کو آئی ہے اک صدا "آجا"

میں نے جنگ جیت لی اندھیروں سے
اب مجھے روشنی دکھا آجا

اب لبوں کی تجھے ضرورت ہے
میرے دل میں پڑی دعا آجا

اویس علی

خاک سمجھے کوئی ہمارا دکھ
یاد اس کی بھی ہے خدارا دکھ

خود کو میرا لباس کہتے ہو
مجھ سے ملتا نہیں تمھارا دکھ

شعر کہتا ہوں ہجر پر تیرے
لگنے لگتا ہے پھر تو پیارا دکھ

لوگ کالا لباس کہتے ہیں
ہم نے اوڑھا ہے جب تمھارا دکھ

تم نے دیکھا نہیں اویس مجھے؟
چہرہ کہتا ہے اب تو سارا دکھ

جیاراجپوت (اوکاڑہ)

آج وہ سب کو میری داستان سنا کر رویا،
کہ آج لوگوں کو وہ میرا نام بتا کر رویا،

میں آج بھی منتظر ہوں اس کی،
کہ آج وہ یہ اپنا احسان جتوا کر رویا۔

عشق میں ہو گی خاموشی اس کی بھی،
کہ وہ بھری محفل میں مجھے آزما کر رویا،

چن لی تھی ہم نے محفل تنہائیوں کی،
کہ آج وہ مجھے بھری محفل میں پا کر رویا،

جب سنائی شب غم کی داستان محفل میں،
تو آج وہ پہلی بار کئی مرتبہ مسکرا کر رویا،

سمجھ نہ آئی محبت پائی یا نہیں ہم نے،
مگر آج کی شب وہ مجھے اپنا بنا کر رویا،

ہم نہ تھے ،مگر تھا وہ لباس عروسی میں،
کہ آج وہ اپنی شب عروسی سجا کر رویا،

فاطمہ ندیم (کراچی)

کرکے الفت جہاں میں دیکھ لیا
تجھ سے دل بھی لگا کے دیکھ لیا

دربدر ہوگئے جہاں میں ہم
اپنا مسکن بنا کے دیکھ لیا

ہیں جہاں میں بہت غریب وطن
ان سے رشتہ بنا کے دیکھ لیا

جی میں آیا تو ان سے دل بھر کے
اپنے دل کی سنا کے دیکھ لیا

ہوکے رسوا جہان و دنیا میں
ان سے رشتہ چھڑا کے دیکھ لیا

ہوکے بے بس فرح نے دنیا کو
ان کا خوگر بتا کے دیکھ لیا

اقر حفیظ (ہری پور)

وفا کی بھی تو سزا نہ دے مجھ کو
جو پر اثر نہیں وہ صدا نہ دے مجھ کو

جدا ہو کر جینے کی دعا دیتے ہو
بظاہر تو دعا پر بد دعا نہ دے مجھ کو

مجھے غمِ جدائی نہیں بے وفائی ہے
میری چاہ کا یہ صلہ نہ دے مجھ کو

جو کر لیا ہے عہد پھر جاں اس سے
حیات اتنی بھی خدا نہ دے مجھ جو

دل میں تیرے جفا کی جو آگ بھڑکی ہے
پر خطر ہوں کہ وہ جلا نہ دے مجھ کو

عنادل تو ان سے وفا کی امید رکھ
اے دل یہ جھوٹا آسرا نہ دے مجھ کو

نائلہ راٹھور

ضرورت ہی نہیں اب قربتوں کی "
کہ عادت ہو گئی ہے فرقتوں کی

زمیں قدموں کھینچے جو نہیں ہے
عنایت ہے یہ میرے دوستوں کی

چھپانا سر ہوا جاتا ہے مشکل
نہیں پہچان مجھکو دشمنوں کی

زمانے نے ہے رکھا ٹھوکروں پر
بنی ہوں دھول جب سے راستوں کی

اگر دل میں نہ ہوتیں رنجشیں تو
حقیقت ہی نہیں کچھ فاصلوں کی

اروی عمران

سنو!!!
محبت کی داستانیں سنی ہونگی بہت
لیلی مجنوں کی کہانیاں سنہ ہونگی بہت
جنون محبت کی انتہا سنی ہونگی بہت
لیکن آج ایک کہانی سناتی ہوں
بے نام سی اک داستان سناتی ہوں
جو نہ لیلی مجنوں کی ہے نہ ہیر رانجھے کی

یہ کہانی ہے ایک لاابالی سی لڑکی کی
بے پرواہ سی نرالی سی
اسکو آتا تھا ہنسنا بہت
لیکن محبت کے سانپ نے اسکو بھی ڈس لیا
یہ محبت کسی مجنوں رانجھے سے نہیں تھی یہ ایک دوست کی
دوست سے محبت تھی
کچھ سال گزرے خوشگوار بہت
پیار محبت اور عیاشیاں بہت
نہ جانے محبت کو کس کی نظر کھا گئی
یہ دوستی دنیا کو ایک پل نہ بھائی
محبت میں ایک تیسری آئی
جو دوستی کو سانپ کی طرح کھا گئی
زندگی کو بے رونق سی کر گئی
اب نہ محبت ہے نہ دوستی ہے
زندگی میں ایک بے نام سی اداسی ہے
وہ لاابالی اب سنجیدہ سی ہے
اسکو محبت سے اب نفرت سی ہے
وہ اندر سے مر چکی ہے
زندگی اک کٹھن سی ہے
اسکے لاس یادوں کے ہیں سلسلے بہت
داستانیں داستانیں داستانیں بہت
لیکن اسکا دل چیر چکا ہے
زندگی سے بے زار ہو چکا ہے
وہ اب روتی رہتی ہے
خاموش ہی خاموش سی رہتی ہے
اسکو زندگی ایک نہ بھاتی ہے
مرنے کی وہ اب تمنا کرتی ہے
مرنے کہ وہ اب تمنا کرتی ہے

وقاص معین

اے پاک وطن توں ہے پیارا وطن، توں ہے پیارا وطن تو

ہمارا وطن

تجھ پہ قربان، جسم و جان، اے وطن

اے پاک وطن توں ہے پیارا وطن، توں ہے پیارا وطن تو

ہمارا وطن

نثار تجھ پے، عقیدتیں میں کرو

پیار بھی میں اپنا، سارا وار دوں

اے پاک وطن توں ہے پیارا وطن، توں ہے پیارا وطن تو

ہمارا وطن

جشن تیرا، یوں جھوم کر منائیں گے

ساری دنیا کو یہ بتائیں گے

تو ہے پیارا وطن، تو ہمارا وطن

تجھ پہ قربان، جسم و جان، اے وطن

لاکھوں جانیں لگوائی تھی، جو تیرے لئے

ان قربانیوں کو، ہم نہ ضائع ہونے دے

شہیدوں کے خون کا، ہر ایک قطرہ

زخموں پہ تیرے اب تک، مرہم بنا ہوا

ساتھ، ہم نہ چھوڑیں گے، تیرا کبھی بھی

دشمن کے سارے ارادے، ہم ناکام بنا دے

تو وطن ہمارا ہے، ہم ہی پاسباں تیرے

اے پاک وطن توں ہے پیارا وطن، توں ہے پیارا وطن تو

ہمارا وطن

کامران فرمان علی

ایک وقت وہ بھی آئے گا جب اپنا سبز پرچم چاند پر لہرائے گا

اپنی خوشبوں سے یہ سارے جگ کو مہکائے گا

شاد باد ہوگا اپنے لہوں سے یہ ملک اپنا

ہم رہے نہ رہے رہے گا جہاں میں سدا یہ ملک اپنا

روشنی سے اس کی روشن زمیں کا زرا زرا ہو جائے گا

ایک وقت وہ بھی آئے گا جب اپنا سبز پرچم چاند پر لہرائے گا

اپنا پرچم بنے گا سارے جہاں میں پہچان اپنی

ہم بنے گے جان اس کی یہ بنے گا شان اپنی

ساری فضا میں رنگ اس کا گھل جائے گا

ایک وقت وہ بھی آئے گا جب اپنا سبز پرچم چاند پر لہرائے گا

اس پرچم کے بنے گے ہم سب رکھوالے

کس میں ہوگی اتنی جرات جو اس پہ بری نظر ڈالے

اس کی طرف بڑھنے والا ہر قدم کٹ جائے گا

ایک وقت وہ بھی آئے گا جب اپنا سبز پرچم چاند پر لہرائے گا

اپنی خوشبوں سے یہ سارے جگ کو مہکائے گا

حناسلیم گردیزی

ابھی تو فرصت نہیں ہے
پھر جب ملے گا تو!!...
جشن آزادی مبارک ہو
تمہیں کہیں گے
ابھی تو!!......
اپنوں کے دکھ پر
درد کی تحریر لکھ رہی ہوں
ہاں!!......
میں کشمیر کی داستان
لکھ رہی ہوں!!...
اک وادی ہے کشمیر!!.....
جسے لوگ "جنت نظیر " کہتے ہیں
مگر!!............
عجب ماجرا ہے اس جنت کا
ہر سو لہو بکھرا ہے مظلوموں کا
ہر طرف لاشے ہیں وادی کی سڑکوں پر
کہیں بنت حوا کی ردا تار تار ہے
ہاں!!......
اک وادی ہے کشمیر
اس کی داستاں ہے یہ!!......
جہاں سورج پہ پہرے ہوتے ہیں
جہاں نا جیتے ہیں نا مرتے ہیں
بس آہ وزاری کرتے ہیں
جہاں ہر پل سوگ کا موسم ہے
جہاں اندھی طاقتوں کا راج ہے
دیکھو!!.......
یہ کشمیر ہے!!...... .. ..
زعفران کی دھرتی ہے
سونا اگلتی زمین ہے
دریاں کی سرزمین ہے
لیکن!!.........
دھرتی مینہ کو ترستی ہے
ہاں!!......
یہ کشمیر ہے!!........
جہاں دلوں پہ بھی پہرے ہوتے ہیں
جہاں آہ و سسکیوں کا ڈیرا ہے
اے اہل پاکستان!!.......
سنا ہے پھر تمہارا جشن آزادی
قریب ہے!!......
ذرا یہ تو بتا!!
کشمیر سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟؟
شہ رگ کا....؟؟
یا 70 سالہ جھوٹے وعدوں کا؟؟
سنو!!.......
جب تم جشن آزادی مناتے ہو
تمہیں کشمیر یاد نہیں آتا؟؟؟
جب تم ہلالی پرچم لہراتے ہو
تمہیں وادی میں ہلالی پرچم
میں لپٹے شہدا کے لاشے یاد
نہیں آتے....... ...؟؟
جب اپنی گلیاں سجاتے ہو
تمہیں وادی کی گلیوں میں
بہتا لہو یاد نہیں آتا......؟؟
ہاں!!...........
تمہیں یاد آتا ہے
پتا ہے کب؟؟؟؟
جب وادی میں کسی نامی گرامی مجاہد
کا لاشہ اٹھتا ہے!!.....
یا پھر!!.......

جب تمہاری سرحدوں پر دشمن
دھاوا بولتا ہے !!.......
تم کشمیر ہماری شہ رگ کا راگ
الاپتے ہو !!.....
پھر آہستہ آہستہ ہمیں بھول جاتے ہو
سنو !!..............
ان 70 سالوں کے تمھارے شہ رگ
کے عہد میں !!...........
ہم نے !!............
بہت مشقتیں جھلیں ہیں
بہت درد سہے ہیں
بہت عزتیں پامال ہوئی ہیں
بہت جوانیاں غروب ہوئی ہیں
بہت سہاگ اجڑے ہیں
بہت بچے یتیم ہوئے ہیں
سنو !!.......
اب ہمیں ان جھوٹے وعدوں سے
آزاد کردو !!.......
ہمیں انصاف دلا دو
اے اہل پاکستان !!..........
ابھی تو دل غم سے چور ہے
احساس شعور بھی جاگ رہا ہے
ابھی نہیں !!........
ابھی تو میں اک داستاں لکھ
رہی ہوں !!......ہاں !!..........
کشمیر میں بہتے لہو کی
تحریر لکھ رہی ہوں !!....
پھر کبھی سہی
پھر کہہ دوں گی
ابھی تو میں اپنی ہی داستاں
لکھ رہی ہوں......

سیدہ صبیحہ نقوی

سوچ کا کوئی در کھولا میں نے
دل کو جب بھی ٹٹولا میں نے
کچھ نہ اندر خاص ملا
بس ایک ہی مجھ کو راز ملا
لہو سے سینچ کے جس کو پالا
غم کے اندھیروں میں آج اس کو ڈھالا
دشمن کے ہاتھ خود ڈور تھما دی
اپنی آزادی ہم نے آپ گنوا دی
دکھلاوے کی رسم بھی خوب نبھاتے ہیں
سبز جھنڈے جب ہر سو لہراتے ہیں
آزادی آزادی کے گیت پرانے
لہو میں ڈوبے وطن کے ترانے
فراموش ہوئی ہے رسم آزادی
پرکھوں کی محنت ہم نے بھلا دی
آ دعا کو آج ہاتھ اٹھائیں
وطن کے لئے اپنے کر دکھائیں
خواب جو بھی رہ گئے ادھورے
تکمیل کو ان کی قدم بڑھائیں

معصومہ ارشاد سولنگی

میہڑ سندھ پاکستان

بہت پیار مجھے میرے اس وطن سے ہے
بڑا ہی ناز مجھے خوش نما چمن پہ ہے
مری رگوں میں خوشی ہی خوشی سمائی ہے
کہ میرے ملک میں ہر سو بہار چھائی ہے
غلام ہم تھے غلامی سے ہو گئے آزاد
ہوئے ہیں اپنے ہی آزاد ملک میں آباد
پھنسی بھنور میں جو کشتی اسے نکال لیا
ہمارے قائد و اقبال نے سنبھال لیا
قسم یہ کھائی ہے جب تک رہے گا دم میں دم
لڑیں گے دیس کی خاطر , وطن کی خاطر ہم
پر اس سے پہلے تو لڑنا ہے ہم نے غربت سے
شکست دیں گے جہالت کو علم و عظمت سے
جو میرے دیس میں تعلیم عام ہو جائے
تو تابناک یہاں صبح و شام ہو جائے
یہ ظلمتیں , یہ اندھیرے رہیں گے پھر کب تک
ہمارے ذہن پہ دے گا شعور جب دستک
ہم اپنے آپ میں ہر وقت گم ہی رہتے ہیں
برا نظام کو اور اس وطن کو کہتے ہیں
خبر ہماری بھی ہو جائے گی ہمیں آخر
یہ جان اپنی لٹائیں گے ملک کی خاطر

میرے دیس کے جوانوں کے نام

سید سلطان خاموش

میرے وطن کے بلند چنارو
سدا سلامت کھڑے ہی رہنا
جو آئے آندھی طوفان آتش
بکھر نہ جانا، . جڑے ہی رہنا
تم اپنے دیس پہ مر مٹو
جاں کی بازی بھی لگا دو
کرا دو تن کہ ہزاروں ٹکڑے
یا آگ میں ل خود کو جلا دو
وطن کی حرمت رہے . پائندہ
خیال رکھنا، جگے ہی رہنا۔
میرے وطن کے۔۔۔۔۔
کوئی نہ غاصب پھر سیکھو مے
خوار یت سے گلوں کو چومے
چمن میں بلبل گنگنائے
کوئی ترانہ منہ ہی منہ میں۔
بہار آ کے پھر نہ جائے
لہو بہانہ، کٹے ہی رہنا
میرے وطن کے۔۔۔۔
تیر و ترکش ہزاروں لائے
تم سینے اپنے سجائے رکھنا
کوئی آنچل اتر نہ پائے
سروں پہ ہاتھ پھیلائے رکھنا
دیوار آہن "خاموش " رہنا
قدم بڑھانا، ڈٹے ہی رہنا۔
میرے وطن کے بلند چنارو
سدا سلامت کھڑے ہی رہنا

پری شے

اے ارض پاک تم پر
ہو رحمت رب کی
رکھی گ ۓ بنیاد
لا الہ الا اللہ پہ جسکی
سارے جہاں میں پھر
کیوں نہ ہو ہمارا بول بالا
اے پاک سرزمین
رہے سدا نام تمھارا
لاکھوں قربانیاں دے کے
تم کو پایا ہم نے
خون سے سینچ کے
تمھارا نقشہ بنایا ہم نے
جب جا کے ملا ہے
ہم کو وطن یہ پیارا
جھوم کے لگاتے ہیں
اس لئے حق کا نعرہ
اے پاک سرزمین
رہے سدا نام تمھارا
پاکستان زندہ آباد
پاکستان پائندہ باد

مہوش احسن

میں سانولی سی لڑکی ...
بوجھل ہیں سانسیں جسکی
چہرہ ہے سنجیدہ
آنکھیں ہیں حجاب آلودہ
رخسار پہ ہیں زردیاں جسکی
میں سانولی سی لڑکی
پیشانی پہ نمایاں ہے
بدبخت کی مہر...
کوئی ھاتھ دیکھے
کوئی پیر دیکھے ..
پھیر لے ہر بندہ نگاہوں کو
نہیں مجھ میں کوئی گوہر ...
میں سانولی سی لڑکی
اڑ جائے کبھی آنچل
بہہ جائے کبھی کاجل
سرمء ہوں شامیں
بھیگ جاں بن بادل
میں سانولی سی لڑکی ..

عبیرہ (اسلام آباد)

وہ اک ضدی سی لڑکی تھی
کھلونے توڑ دیتی تھی
اگر کچھ دل کو بھا جائے
اسے وہ چھین لیتی تھی

کبھی جو روٹھ جاتی تھی
تو ہنسنا بھول جاتی تھی
پھلا کر منہ اک کونے میں
وہ دنیا بھول جاتی تھی

بڑے نخرے دکھاتی تھی
جب ماں اس کو مناتی تھی
سرہانے ماں کے سر رکھ کر
وہ سارے غم بھول جاتی تھی

فکر نہ تھی اسے کل کی
وہ ہر لمحے کو جیتی تھی
بہت پاگل سی لڑکی تھی
بہت پاگل سی لڑکی تھی

وہ ایک منظر "

حمدہ طارق (ساہیوال)

عجیب رستوں کے خاک موسم
محبتوں میں بدل رہے ہیں
ہوا میں بوندیں مچل رہی ہیں
غرور ساگر میں ڈھل رہے ہیں
اچھل کے بادل سے ایک جھونکا
ہوا کے دستے زمیں پہ اترا
کنول پہ ٹھہرا حسن میں آیا
ہر ایک لمحے میں جگمگایا
بنا کے آنسو حساب مانگے
جو مسکرایا تو خواب مانگے
جھکا کے آنکھیں سوال پوچھے
اٹھا کے آنکھیں جواب مانگے
بہک کے خوشبو سے سے گھر بچایا
دلوں کو توڑا تو در بچایا
انا میں آیا سفر بچایا
ملال دے کر ہنر بچایا
عجیب ہستی کی چاہ مانگی
خوار ہو کر بھی چاہ مانگی
وہ ایک ہستی گمان کی تھی
چھوا تو وہ بھی انسان کی تھی

در نجف (سکھر)

میرے ہم نفس، میری زندگی
کبھی یوں بھی آ میری نگاہ میں
کہ تجھے دیکھ سکوں میں اس طرح
تجھے پاس میں اس طرح
مجھے میرا لگے تو پوری طرح
میرے ہم نفس میری زندگی
کبھی یوں بھی آ میرے روبرو
تجھے چھو سکوں
تیری ہو سکوں
نہ ہو درمیاں کوء فاصلہ
نہ جداء کا ہو ڈر زرا
میرے ہم نفس میری زندگی
کبھی یوں بھی آ میری پناہ میں
تجھے دل میں اپنے چھپا سکوں
تجھے سب سے اپنا میں کہہ سکوں
تجھ پہ اپنا حق میں جتا سکوں
کوء تجھ کو مانگے خدا سے بھی
تو خدا سے بھی میں لڑ سکوں
میرے ہم نفس میری زندگی۔۔۔
میں سب کو یہ بتا سکوں
کہ ہے تو منسلک میری ذات سے
تو میں کیسے ذات کو بانٹ لوں؟

اداسی

انابیہ رحمٰن (ڈیرہ غازی خان)

اداسی جب بھی میری رگوں میں
زہر بن کر دوڑتی ہے ..
اور اک الجھن سی بڑھاتی ہے..
دل کے کسی ویران گوشے میں
اک کسک سی اٹھتی ہے
اسی پل دل سہم سا جاتا ہے ..
میرے احساسات بلک اٹھتے ہیں..
محبت آ کر پھر سے
میری روح میں اک
سرگوشی کرتی ہے
میری آنکھوں کے گوشے
پھر سے نم ہو جاتے ہیں
میری بھیگی سی پلکوں پر..
کوء جگنو سا دھر دیتی ہے..
بہت معصومیت سے
پھر سے محبت مسکراتی ہے
اور اک عہد وفا دہراتی ہے..
تم مجھے پھر بھول رہی ہو ناں..
اس ظالم دنیا سا بن رہی ہو ناں۔۔
تم ظالم پھر ہو رہی ہو ناں..
تمہیں بس اک روشنی بننا ہے ..
محبت کو دہرانا ہے
محبت کرتے جانا ہے
اپنی ہی آنچ میں رہنا ہے..
یونہی جلنا اور پگھلنا ہے
آخری سانس تک سن لو تم
بس تمہیں شمع سا جلنا ہے!..

نبیلہ خان

محبت مارتی مجھ کو
مین جب سوچوں
کہ تم بن رہ نہ پاوں گی
یہی احساس رگوں کو
کاٹتا ہے کند چاقو سے
میرے دل کے سبھی خلیے
پکارے نام تیرا بس
مجھے جینا ہے بس تم سنگ
اکیلے مین نہیں جینا
سمجھ جاو نہ تم یہ بات
مجھے کیوں درد دیتے ہو
دوری کا، جدائی کا
سنو "جاناں "
اعلی الاعلان کہتی ہوں
محبت مارتی مجھ کو
محبت مارتی مجھ کو

رباب مشتاق. (کراچی)

ترکِ تعلق پر اک بار بھی چاہتِ نباہ نا تھی ،
الہی پھر وہ کیوں کر مجھے یاد آ رہے ہیں .

آشیانے کو چنگاری خود ہم نے ہی دی تھی،
پر یہ اپنے کیوں شعلوں کو ہوا دے رہے ہیں .

کہنے کو تو ہر بات ہی ہمارے اختیار میں تھی،
پھر ہم پیاسے کیوں دریا میں مرے جا رہے ہیں.

لفظوں کے وار سے یہ دنیا مجھے گھائل کرتی تھی،
اج اس کے باسی کیوں جینے کا حق مانگ رہے ہیں.

اپنی ذات کو میں نے جس کے سامنے ڈھا دیا تھا،
وہ گرا ہوا سمجھ کر مجھے کیوں کچل کہ جا رہے ہیں.

چاندنی رات میں جس نے سنگ جینے کی قسم کھائی تھی،
آج وہ تنہا مجھے کیوں زندہ درگور کر رہے ہیں .

مدیحہ مقصود

آ گ جلاو پانی لاو
دونوں کو پھر ساتھ ملاو
پانی میں پھر آ گ لگاو
پانی ھی سے اس کو بجھاو
دیکھوتو پھر کیا ھوتا ھے
نارنجی اور زرد سے شعلے
یا پانی کا شور جو بولے
دیکھوتم کو کیا بھاتا ھے
آ گ اور پانی مل نہیں پائے
اک دوجے میں گھل نہیں پائے
سمجھ گئے نا?!
اب ضد چھوڑو
تم ھو آ گ اور میں ھوں پانی
یہیں ھوگئی ختم کہانی

عام سی لڑکی"

اقرا شوکت (شیخوپورہ)

میں اِک عام سی لڑکی
میرا اِک عام سا دِل ہے
میرے اِس عام سے دِل پر
تمھارا نام لکھا ہے
یہ بنجر سی میرے دِل کی
اِک خالی سی دنیا ہے
یہاں اِک نام رہتا ہے
بڑا ہی عام رہتا ہے
میرے اِس عام سے دِل کا
اگر جو زور چلتا ہو
تو تم کو چھین لائے یہ
بھری دنیا کی محفل سے
پھر تم سے سجائے یہ
میرے اِس دِل کی دنیا کو
یہ وہ دنیا ہو پھر جس میں
کبھی جو پاس آ تم
یہاں ٹھہر و تو دیکھو تم
یہاں اِک شخص رہتا ہے
اسی کا حکم چلتا ہے
اسی کا زور چلتا ہے
کبھی تو پاس آ تم
میرے اِس عام سے دِل کو
جینا پھر سکھا تم